علمِ تصوف

تصنیف خواجہ محمد عباد اللہ اختر

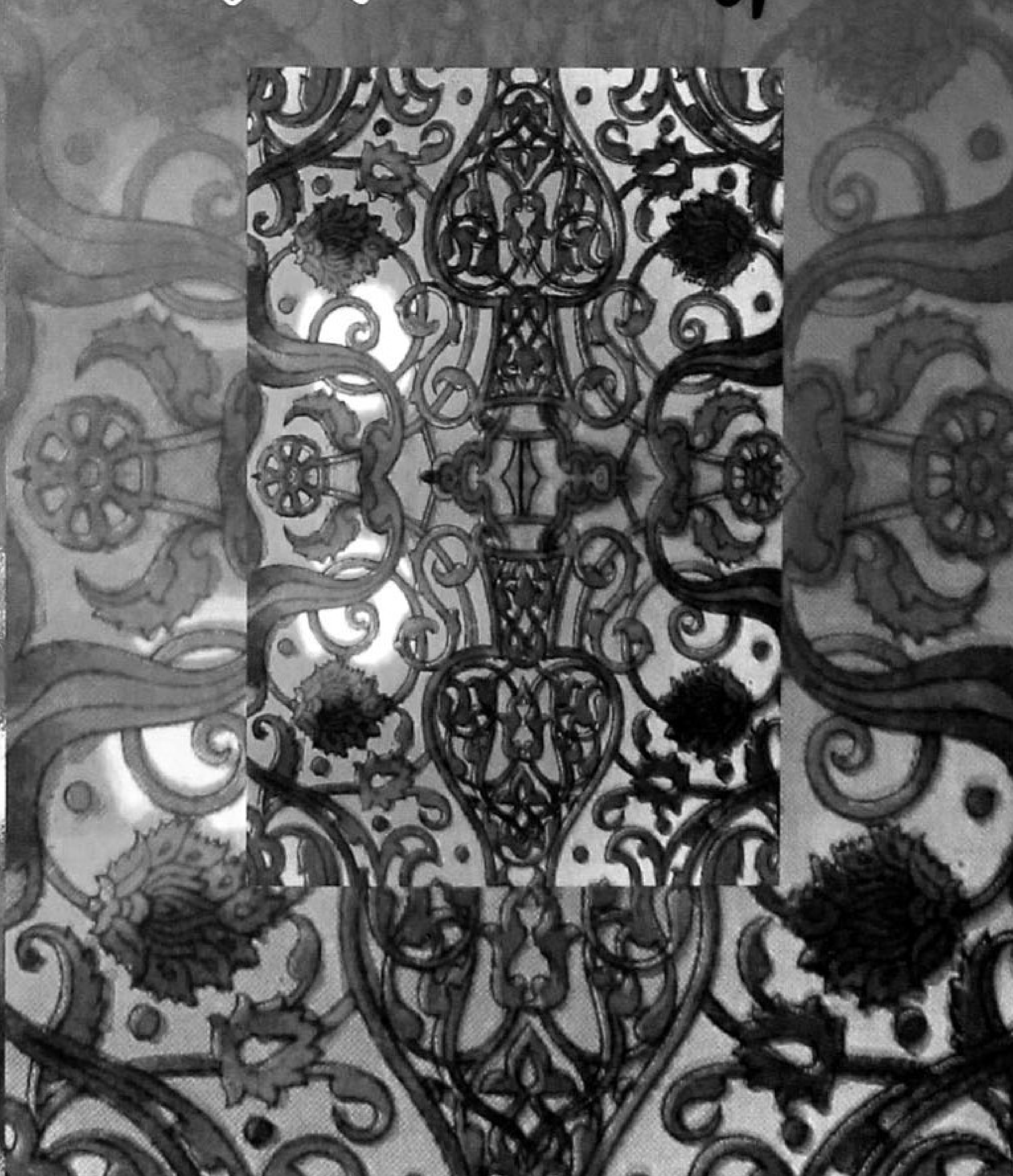

Marfat.com

Marfat.com

علمِ تصوّف

تصنیف: خواجہ محمد عباد اللہ اخترؔ

Marfat.com

تخلیقات

علی پلازہ، 3- مزنگ روڈ، نزد فیملی ہسپتال، لاہور، فون: 7238014
Web Site: http://www.takhleeqat.com
E-mail: takhleeqat@yahoo.com

قارئین کرام سے التماس

زیرِ نظر کتاب میں کچھ مقامات پر قرآن پاک کی آیات اور احادیثِ نبوی حوالہ کے طور پر درج کی گئی ہیں، نیز ان آیات و احادیث کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور طباعت و اشاعت کے تمام مراحل میں انتہائی احتیاط سے کام لیا گیا ہے، تاہم انسانی کوشش میں غلطی کا احتمال بہرحال باقی رہتا ہے۔ کسی بھی غلطی کے لیے ناشر، طابع، کمپوزر اور پروف ریڈر اللہ ربّ العزت سے عفو و درگزر کے خواستگار ہیں۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر کوئی غلطی نظر سے گزرے تو "تخلیقات" علی پلازا، 3-مزنگ روڈ، لاہور کے پتہ پر اطلاع فرمائیں، تاکہ اُن کے شکریہ کے ساتھ آئندہ ایڈیشن میں درستگی عمل لائی جاسکے۔ شکریہ۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	علم تصوّف
مصنف	خواجہ محمد عباداللہ اخترؔ امرتسری
ناشر	تخلیقات، لاہور
اہتمام	لیاقت علی
کمپوزنگ	الیاس چوہدری۔ بلھے شاہ کمپوزنگ سنٹر، لاہور (5821875)
پروف ریڈنگ	ریاض احمد، بلاغت حسین
سرورق	ریاظ
سنِ اشاعت	(زیرِ نظر ایڈیشن) 2004ء
طابع	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
قیمت	100 روپے

Marfat.com

خواجہ محمد عباداللہ اختر کی گراں قدر تصنیف ''علمِ تصوّف'' کی طبعِ جدید مصنف مرحوم کی پوتی محترمہ ناز شوکت صاحبہ کے تعاون اور شکریہ کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ محترمہ اپنی علالت کے باوجود نہایت محبت اور محنت کے ساتھ مصنف کی کتب کو تلاش کر کے شائع کروا رہی ہیں۔ ادارہ ''تخلیقات'' محترمہ ناز شوکت کی مساعی پر ان کے لیے سپاس گزار ہے۔

خواجہ محمد عباداللہ اختر نے محترمہ ناز شوکت کے لیے ایک خصوصی تحریر میں لکھا ہے:

''میری تمام کتب کی مالکہ میری پوتی ناز اختر المعروف ناز منٹو BA,B,Ed ہے۔ اور میری تمام کتب کا حق تصنیف بھی اس کا ہے۔ میں نے کبھی کسی کتاب کا معاوضہ نہیں لیا۔ ناز اگر چاہے تو کتابیں خود شائع کر سکتی ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں اب نایاب ہیں، مگر ان کی مانگ بہت ہے۔ مثلاً ''اُردو ترجمہ اور شرح دیوانِ حافظ''۔ اس کے دو ایڈیشن شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نے شائع کیے۔ اب ان کی دُکان ہی بند ہے اور کتاب کی اشاعت بھی رُک گئی ہے۔ اس کے علاوہ ''بغداد'' اور ''مشاہیر اسلام'' ہے۔ ''دمشق'' مطبع امرتسر نے شائع کی ہے۔ اس کا بھی میں نے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

''یہ یادداشت میں اپنی دستخطی تحریر کر رہا ہوں کہ بوقت ضرورت کام آئے۔''

عباداللہ اختر
جہلم، ۱۱ دسمبر ۱۹۵۹ء

Marfat.com

عکس تحریر خواجہ محمد عباد اللہ اختر

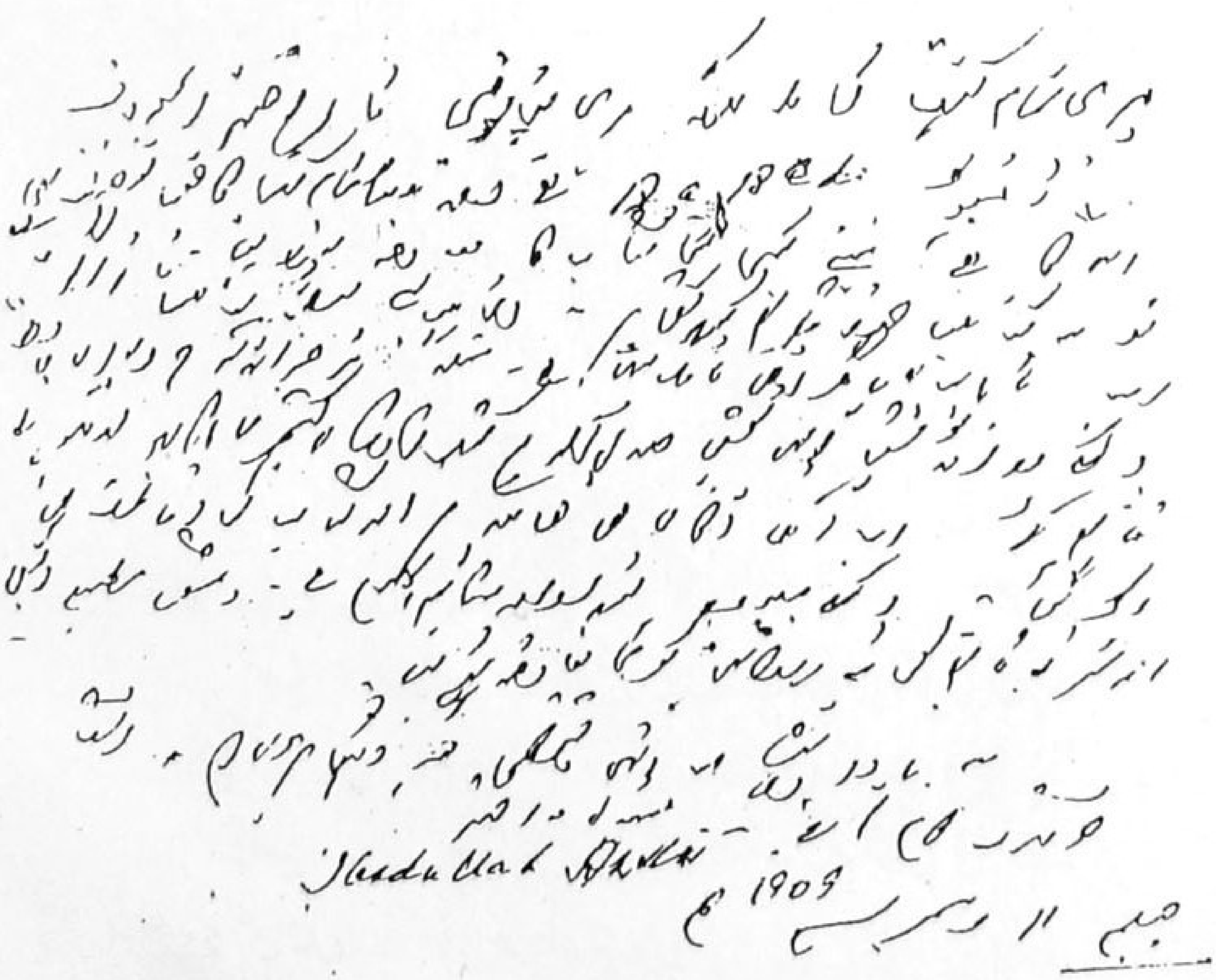
Ibadullah Akhtar
1909

Marfat.com

ترتیب

الحمد للہ	7
یادِ رفتگاں	8
ارشادات	9
علم	14
مقالات	21
توکّل	32
خوف و رجا	38
اخلاقیات	48
اصطلاحات و ارشادات	58
خیر و شر	70
وحدتِ وجود و شہود	72
ظل	77
تجدد امثال	80
تصوّف	83
وجہ تسمیہ	83

Marfat.com

قارئین کرام سے خصوصی التماس

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خواجہ محمد عباداللہ اخترؔ برصغیر پاک و ہند کے سربرآوردہ دانش وَر تھے۔ آپ نے اوائل عمر ہی سے علم و عرفان کی بلند منازل طے کر لیں اور عوام کے ذوق کے مطابق عام فہم زبان اور دل پذیر طرزِ بیان میں نہایت دقیق مسائل پر قلم اُٹھایا۔ خواجہ صاحب کے تبحرِ علمی کی بنا پر مملکت پاکستان کے علمی اداروں، 'ادارہ ثقافت اسلامیہ' وغیرہ نے اپنے ابتدائی ایام میں اُن کی خدمات سے استفادہ کیا اور ان کی گراں قدر کتب بھی شائع کیں۔ آپ کی شائع شدہ کتب امتدادِ زمانہ اور تقسیم برصغیر کے دوران میں برپا ہونے والے حالات کی بنا پر اہل علم کی دست رَس سے باہر ہو گئیں۔ اس بارے میں مصنف مرحوم کو بہت قلق تھا۔

خواجہ محمد عباداللہ اخترؔ امرتسری کی قابل فخر و ناز پوتی محترمہ ناز شوکت صاحبہ خواجہ صاحب کی کتب کی تلاش کے لیے ہمہ وقت سرگرم رہتی ہیں۔ ان کی کوششوں میں ادارہ 'تخلیقات' اُن کا ہاتھ بٹا رہا ہے اور دست یاب ہو جانے والی کتب کو شائع کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

قارئین کرام سے خصوصی التماس ہے کہ خواجہ محمد عباداللہ اخترؔ مرحوم کی کتب میں سے اگر کوئی کتاب، اُن کا دستی تحریر کردہ مسودہ یا خط یا کوئی دیگر تحریر کسی ذریعہ سے مل سکے تو براہِ کرم محترمہ ناز شوکت صاحبہ، اُن کے لائق فرزند محترم بلال شوکت خواجہ، یا ادارہ 'تخلیقات' کو اطلاع فرمائیں۔ ادارہ 'تخلیقات' آپ کے تعاون پر شکر گزار ہوگا۔

فون نمبرز:

مسز ناز شوکت	042-5165120
بلال شوکت خواجہ	0300-8418688
تخلیقات، لاہور	042-7238014

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

سالہا پیروی و خدمتِ رِنداں کردم تا بفتوائے خرد حرص بزنداں کردم
من بسر منزل عنقا نہ بخود بردم راہ قطع ایں مرحلہ با مرغِ سلیماں کردم
ہیچ کس را نرسد در خم محرابِ فلک آں تنعم کہ من از ہمتِ سلطاں کردم
نقش مستوری و مستی نہ بدستِ من وتست آنچہ استادِ ازل گفت بکن آں کردم

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظؒ
ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

Marfat.com

یادِ رفتگاں

مگو گزشتہ رفیقاں زدِل فراموشند
کدام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوشند

تو سخت بے خبری ورنہ رفتگاں یکسر
زخجلت مژہ وا کردن تو روپوشند

اشارہ ایست پرافشاں زگردِ تربت شاں
کہ خفتگانِ دلِ خاک جملہ آغوشند

ہنوز زحمت سعی تو می کشند بخاک
تو تازِ بارِ تعلق نرستۂ دوشند

بچشمِ بستہ نگاہِ کہ ایں پری صفتاں
نزاہت انجمنِ شیشۂ خانہ ہو شند

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظر بودند
کنوں بہ پردۂ دل داغہائے خاموشند

نرفتہ اندازیں بزم تا سخن باقیست
زدیدہ رفتہ حریفاں ہنوز درگوشند

میرے شیخ طریقت بابا محمد خلیل قادری فاضلی قدس سرہٗ

اُمی بود کہ ما از اثر صحبت او
واقف از سرِّ نہاں خانہ اسرار شدیم

یارب آں معنی پناہاں را بغفراں شاد کن
خاک ایشاں را بنورِ قدس فیض آباد کن

سایہ دستی کہ از شوق دعا برداشتند
در ریاضِ خلد برگِ طوبی وشمشاد کن

ہرچراغے کزمزارشاں کند کسب فروغ
پرتوش را تا قیامت ”دور باش“ باد کن

زندگی از ذات شاں پیرایۂ صد لطف داشت
حشر شاں ہمدوشِ رحمتہائے فضل ایجاد کن

Marfat.com

ارشادات

تصوف کی اصل قرآن حکیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ''وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ'' کا اُسوہ حسنہ ہے اور تابعین اور تبع تابعین اور دیگر صوفیہ محققین کے اقوال اور ان کی تصانیف سے تصوف کی حقیقت نظری واضح ہو جاتی ہے۔ آیات بینات اور احادیث اور ائمہ دین کے اقوال کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ فہم و تفہیم کے لیے ہم اختصار سے کام لیتے ہیں۔

توحید

قرآن عظیم شروع سے آخر تک توحید ہی کا بیان ہے۔

''قل هو الله احد'' (۳۰/۷) یہ توحید قولی ہے

شهد الله انه لا اله الا هو ' والملئكة و اولو العلم (۲/۴) یہ شہادت عینی ہے۔

امام راغبؒ ''مفردات'' میں لفظ ''شهد'' کے تحت لکھتے ہیں کہ ''الشهود والشهادة الحضور مع المشاهده اما بالبصر او بالبصيرة'' یہی وہ توحید ہے جو اہل تصوف کے نزدیک معتبر ہے۔ چنانچہ مولانا جامیؒ کہتے ہیں کہ:

''مغرور سخن مشو کہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن''

اہل تصوف الوالعلم ہیں۔ اس لیے ان کا مشاہدہ معتبر شہادت ہے۔ ارشاد قرآن ہے۔

''قل هذه سبيلى ادعو الى الله قف على بصيرة، انا ومن اتبعنى، وسبحن الله، وما انا من المشركين'' (۱۳/۶)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ الو العلم کی شہادت ''علیٰ بصیرت'' ہے۔ اور یہ محض بصر سے زیادہ معتبر ہے۔ اسی آیت سے شیخ عطارؒ نے استدلال کیا ہے کہ:

Marfat.com

ہر کہ نادیدہ نام اُو گوید! مشرک است آں فضولِ ناہنجار

مشرکین کی نسبت ارشاد ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ ملائکہ عورتیں ہیں ''اشھدوا خلقھم'' (۲۵/۸) کیا ملائکہ کی پیدائش کے وقت یہ حاضر تھے؟ اس لیے شہادت ''حضوری'' کے ساتھ ہی قابل اعتبار ہے۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ:

حضوری گرہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ متی ماتلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

غلط فہمی پیدا نہ کرنی چاہیے۔ حق تعالیٰ کی ذات بابرکات تو بصر و بصیرت سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ قرآن عظیم آیات میں تذکر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور اولوالالباب جب اختلاف لیل و نہار و تخلیق کائنات میں فکر کرتے ہیں تو اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ''ربنا ماخلقت ھذا باطلا'' (۴/۱۱)

لفی کل شی لہ آیۃ تدل علیٰ انہ واحد

ہرایک شے میں اس کی آیات ہے جو اس حقیقت پر دلیل ہے کہ وہ واحد ہے۔
ارشادِ قرآن ہے کہ:
وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعاً منہ ط
ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون (۲۵/۱۸)
نیز ارشاد ہے کہ:
ومن اٰیۃ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً تسکنوا الیھا
وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ
ان فی ذٰلک لَاٰیٰت لقوم یتفکرون، ومن اٰیٰتہ خلق
السمٰوٰات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی
ذٰلک لاٰیٰتٍ لِّلعٰلمین (۲۱/۶)
نیز ارشاد ہے کہ:
سنریھم اٰیٰتنا فی الاٰفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ
الحق او لم یکف بربک انہ علیٰ کل شی شھید، الا
انھم فی مریۃٍ من لقآ ربھم الا انہ بکل شیٍ محیط (۲۵/۱)

تصوف کی اصطلاحات ''سیر آفاقی'' اور ''سیر انفسی'' انہی آیات سے اخذ کی گئی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں ارشادِ قرآن ہے کہ:

وکذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض و لیکون من الموقنین

اس سیر آفاقی میں حضرت ابراہیمؑ نے ''مشاہدہ'' کیا کہ اجرام سماوی سورج، چاند اور کوکب جن کی پوجا لوگ کرتے تھے، ایسی ہستیاں ہیں جو مستقل بالذات نہیں، مخلوق ہیں اور ان میں وہ سب امور پائے جاتے ہیں جو مخلوق کی خصوصیات ہیں اور ''افلین'' کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس لیے قوم کے سامنے یہی دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

''انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفاً وما انا من المشرکین'' (۷/۱۵)

''سیر انفسی'' علم تصوف کا خاص موضوع ہے۔ نفس انسانی کی تین حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں یہ نفس ''امارہ بالسوء'' ہوتا ہے۔ یہ بدکاروں کی حالت ہے۔ دوسری حالت میں ''نفس لوامہ'' ہوتا ہے۔ اگر کوئی برائی کا مرتکب ہوتا ہے تو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور افسوس کرتا ہے۔ تیسری حالت ''نفس مطمئنہ'' کی ہے اور یہ حالت ''تقویٰ'' سے پیدا ہوتی ہے جب کہ تزکیہ نفس ہو چکا ہو۔ اس کے لیے مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ تاکہ آئینہ قلب سے زنگ کدورت دور ہو اور اس میں ایسی صفائی پیدا ہو کہ تجلیاتِ نورِ حق جلوہ نما ہوں۔

آیات محولہ بالا میں یہ ثابت شدہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کائنات باطل نہیں اور حقائق اشیاء ثابت اور حق ہیں۔ یہ تصوف کا ایک اہم اور دقیق مسئلہ ہے اور بہت کچھ غلط فہمی کا موجب ہوا ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ:

''وما خلقنا السمآء والارض وما بینھما باطلاً ط ذٰلک ظن الذین کفروا فویل للّذین کفروا من النار'' (۲۳/۱۲)

''یتبعون الّا الظّنّ وانّ الظّنّ یا یغنی من الحق شیئاً، فاعرض عن مّن تولّی، عن ذکرنا ولم یرو الاالحیٰوۃ الدنیا، ذٰلک مبلغھم من العلم'' (۲۷/۶)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات باطل نہیں اور جو اسے باطل سمجھتے ہیں، کافر ہیں اور محض ظنیات میں الجھے ہوئے ہیں اور ظنیات کا حقانیت میں کچھ حصہ نہیں۔ یہ تو صاف اور بالکل سیدھی سادھی بات ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کائنات جس میں وہ خود بھی شامل ہیں، باطل ہے تو ''از باطل سخن حق کہ باور دارد'' ان کو اتنا

Marfat.com

شعور نہیں ہے کہ "یقینے خفتہ در ہر پردہ ظن" اور یہ بھی صاف بات ہے کہ "باطل از باطل بر دید حق زحق۔" حق تبارک و تعالیٰ کی حکمت بالغہ سے یہ بعید امر ہے کہ وہ باطل پیدا کرے۔ غالباً اس توجیہہ پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ اللہ بھی حق اور کائنات بھی حق۔ "پس فرق میان من واو چست بگو۔" فرق تو واضح ہے کہ وہ خالق ہے اور کائنات مخلوق۔ اور مخلوق کا قیام بالحق ہے۔ حق ایک ہی ہے۔ حق میں دوئی نہیں اور اسی حق کا مشاہدہ اہل تصوف کائنات آفاقی اور اپنے نفوس میں کرتے ہیں۔ اگر کائنات باطل ہوتی تو توحید پر دلیل بھی باطل ہوتی۔ کائنات سے جو استدلال کیا جاتا ہے، لازم ہے کہ وہ حق ہو اور یہ تو اہل تصوف ببانگ دہل کہتے ہیں کہ:

چہ ممکن است رود داغ بندگی زجبیں زمیں فلک شود و آدمی خدا نشود

یہ ممکن نہیں کہ بندگی کا داغ ماتھے سے محو ہو۔ خواہ زمین آسمان ہو جائے آدمی خدا نہیں ہو سکتا۔

مگو ممکن زحد خویش بگذشت نہ او ممکن شد و نے واجب ایں گشت

یہ مت کہو کہ ممکن اپنی حد سے آگے بڑھ گیا۔ نہ واجب ممکن بنا اور نہ ممکن واجب ہوا۔

نیز

کلام حق ہمی ناطق بر ایں است کہ باطل دیدن از ضعف یقین است

اللہ تعالیٰ کا کلام (قرآن) اس پر قطعی فیصلہ کرتا ہے کہ یقین کی کمزوری کی وجہ سے انسان باطل دیکھ رہا ہے۔

علامہ محمود شبستری کا استدلال ملاحظہ ہو:

ہر آں کس را کہ اندر دل شکے نیست یقیں داند کہ ہستی جز یکے نیست

جس کے دل کے اندر شک نہیں ہے، وہ یقین جانتا ہے کہ ایک کے سوا کسی کی ہستی نہیں ہے۔

جناب حضرت حق را دوئی نیست دراں حضرت من و ما و توئی نیست

حق تعالیٰ کی جناب میں دوئی نہیں ہے۔ اس کی جناب میں مَیں اور ہم اور تو نہیں ہیں۔

Marfat.com

ہر آں کہ خالی از خود چوں خلا شد   انا الحق اندر و صوت و صدا شد

جو شخص ہوائی نفس سے اس طرح خالی ہو جیسے خلا، تو اس کے باطن میں انا الحق کی صوت وصدا ہو گی۔

شود با وجہ باقی غیر ہالک   یکے گردد سلوک و سیر و سالک

وہ وجہ کے ساتھ باقی ہے، ہلاک نہیں ہوتا۔ سلوک وسیر وسالک ایک ہو جاتا ہے۔

حلول و اتحاد دیں جا محال است   کہ در وحدت دوئی عین ضلال است

حلول اور اتحاد اس مقام میں محال ہے کیونکہ وحدت میں دوئی گمراہی ہے۔

حلول و اتحاد از غیر خیزد   ولے وحدت ہمہ از سیر خیزد

حلول اور تحاد تو غیر کے ساتھ ہوتا ہے لیکن وحدت تو سراسر سیر ہے۔

تعین بود کز ہستی جدا شد   نہ حق بندہ نہ بندہ باخدا شد

ایک گرہ تھی جو رشتہ ہستی سے کھل گئی۔ نہ حق بندہ ہوا اور نہ بندہ خدا ہوا

وجودِ خلق و کثرت در وجود است   نہ ہر چہ می نماید عین بود است

خلق اور کثرت کی ہستی وجود میں ہے۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے، ضروری نہیں کہ ہست ہی ہو۔

بنہ آئینہ اندر برابر!   دُرو بنگر، بہبیں آن شخص دیگر

تو اپنے سامنے آئینہ رکھ، اس میں دیکھ، ایک دوسرا شخص بھی نظر آتا ہے۔

یکے رہ بازبیں تا چیست آں عکس   نہ ایں است ونہ آں بس کیست آں عکس

اب غور کر کہ یہ عکس کیا ہے؟ نہ تو یہ ہے، اور نہ وہ! آخر ہے کیا؟

چو من ہستم بذات خود معین   ندانم تا چہ باشد سایۂ من

جب میں اپنی ہستی میں معین ہوں تو معلوم نہیں کہ میرا سایہ کیا ہو گا۔

عدم باہستی آخر چوں شود ضم   نباشد نور و ظلمت ہر دو باہم

عدم ہستی سے کس طرح پیوستہ ہو سکتا ہے؟ نور و ظلمت دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

چو ماضی نیست مستقبل مہ وسال   چہ باشد غیر ازاں یک نقطہ حال

ماضی کی طرح مستقبل بھی مہ وسال نہیں ہے۔ ایک نقطہ حال کے سوا اور کیا ہے؟

علماء اسلام کہتے ہیں کہ توحید دو طرح کی ہے۔ ایک توحید ذاتی اور دوسری توحید صفاتی۔ ذات ہو یا صفات ہوں، وحدت بلا شائبہ شرک ہے۔ اس موضوع پر ہم اس مقالہ کے متن میں بحث کریں گے۔

علم

علم کی قدر و منزلت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انبیاء و رسل نے اللہ تعالیٰ سے ضرورۃً اولاد وغیرہ طلب کی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا، "قل رب زدنی علماً"۔ "اے میرے پروردگار مجھے علم زیادہ سے زیادہ عطا فرما۔" اللہ تعالیٰ جس کو علم و حکمت عطا فرماتا ہے، خیر کثیر عنایت فرماتا ہے۔ علم کی بہت قسمیں ہیں۔ لیکن تصوف کا تعلق علم معرفت و حقیقت سے ہے۔ اس موضوع پر ہم نے اس مقالہ میں بحث کی ہے۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے۔ علم بھی عینی شہادت پر مبنی ہے، جس پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ حکماء بھی یہی کہتے ہیں کہ علم مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ "مشاہدہ" اصطلاحِ تصوف میں عینی شہادت ہی ہے۔ علم کی فضیلت قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ:

بے علم نتواں خدا را شناخت

بلکہ بعض صوفیہ محققین کا قول ہے کہ "بے علم صوفی مسخرہ شیطان"۔ قرآن حکیم کا ایک نام "علم" بھی ہے۔ علم کے ہوتے کسی شک و رَیب کی گنجائش نہیں۔

صوفیہ کرام کی اصطلاح میں "علم" مشاہدہ "آفاقی" اور "انفسی" میں عین مطابقت ہے۔ چنانچہ بیدلؒ کہتے ہیں:

چیست علم؟ اصل قدرت بے چوں ۔۔۔ نظم جمعیت ظہور و بطوں
حسن مرآت عالم و معلوم ۔۔۔ نور تمیز حاکم و محکوم
نزد اہل حقیقت ایجاد ۔۔۔ ہیچ چیزے بغیر علم نزاد
ہر چہ بینی زمفرد و ترکیب ۔۔۔ دارد از علم جوہر ترتیب

"علم" کسی شے کی حقیقت کا ادراک ہے، ایسی شے ضرور ہے کہ موجود بھی ہو۔ خواہ عالم شہادت یا غیب میں۔ اس لیے علم کے حصول کا ذریعہ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، نظری اور عملی اور عقلی وغیرہ ہے۔ آیۃ "والذین اوتوا العلم" اور "اولوا العلم" سے

Marfat.com

مراد وہ لوگ ہیں جن کو کائنات آفاقی اور انفسی کا علم ہے۔ ارشادِ قرآن ہے کہ "فوق کل ذی علم علیم"۔ علماء ظاہر تو اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ درجات علم میں تفاوت ہے اور علم میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے، اور یہ کہ ایک جماعت کا علم، ایک فردِ جماعت سے بلند تر ہوتا ہے، من وجہ صحیح ہے۔(۱) لیکن اس آیہ مبارکہ کا یہ مفہوم ہے کہ ہر ایک صاحب علم کے اوپر "علیم" حق تعالیٰ کی ذات ہے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ "علیم"، "فعیل" کے وزن پر ہے جو "دوام" کے معنی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اشیاء کائنات کا علم ازلی وابدی ہے۔ انسان کو علم اس حد تک نہیں ہوسکتا ہے جو ازذل عمر میں جانتے ہوئے نہیں جانتا اور اس کا علم کبھی کامل نہیں ہوسکتا۔ (۱۴/۱۵)

ارشادِ قرآن ہے کہ "وسع کل شی علما" (۱۶/۱۴) اور "یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم ولایحیطون به علماً (۱۶/۵) اور "ولله ما فی السمٰوٰت وما فی الارض و کان الله بکل شیٔ محیطاً" (۵/۱۵) وان الله کان به علیماً (۵/۱۶)۔
آیات تو اور بھی ہیں لیکن فہم و تفہیم کے لیے یہی کافی ہیں۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی شے چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی پوشیدہ نہیں، خواہ وہ کسی زمان ومکان میں ہو۔

"وما یعزب عن ربک من مّثقال ذرّة فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذٰلک ولا اکبر اِلّا فی کتٰب مبین" (۱۱/۱۲)
یمحوا الله مایشاء و یثبت و عنده' امّ الکتٰب ۝ (۱۳/۱۲)

ان آیات مبارکہ سے صوفیائے محققین نے جو کچھ اخذ کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات "صور علمیہ الٰہیہ" ہیں۔ یہ نظریۂ شیخِ اکبر محی الدین ابن عربی ہے، اس لیے ان کا قول ہے کہ "الحق محسوس والخلق معقول" اس لیے کہ ممکنات تو ایسی ہی صورتیں ہیں، جیسے ہمارے قلب میں بوقت خواب اشیاء کی صورتیں ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہم انہیں اپنے آپ سے باہر دیکھتے ہیں مگر دراصل وہ ہم سے باہر یعنی خارج میں موجود نہیں

(۱): حقیقت یہ ہے کہ وحدت ہمیشہ کثرت پر غالب رہتی ہے اور ہمیشہ فردِ واحد ہی جماعت کی رہنمائی کرتا ہے۔ ہمیشہ علمی اکتشافات فردِ واحد پر ہوتے ہیں۔ اور یہ پختہ دلیل وحدت فی الکثرت پر ہے۔ جمہوری حکومت میں بھی ایک فرد کی شخصیت ممتاز نظر آتی ہے، جس کو علم اور جسم میں فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ ذی علم بہت ہیں لیکن علیم ایک ہی ہوگا۔ یہ حق تعالیٰ کی ذات ہے۔

Marfat.com

ہیں۔ اب فرض کرو ہم نے ایک عالم خیال جس میں ہمارے تصورات ہیں ارادۃً پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عالم ہمارے قلب یا خیال سے باہر عدم ہے اور ہماری ذات اس پر محیط ہے۔ شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ، جو طریقۂ نقشبندیہ میں مجتہد تسلیم کیے گئے ہیں، اپنے مکتوبات میں یہی مثال پیش کرتے ہیں۔ شیخ ممدوح کا عقیدہ ''وحدتِ شہود'' ہے، جس کو ''ہمہ از وست'' بھی کہتے ہیں۔ شیخ اکبرؒ کائنات، جس کو اصطلاحِ صوفیہ میں ''اعیانِ ثانیہ'' کہتے ہیں، حق کا غیر نہیں سمجھتے، کیونکہ ''عدم موجود گردد ایں محال است'' اور کائنات بالبداہت موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ موجود علم حق تعالیٰ میں ہے۔ ''وسع کل شی علما'' اور کان بکل شی محیطا''۔ حق تعالیٰ کے علم سے باہر ممکنات عدم ہیں۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ ''الاعیان ماشمت راحیة الوجود ولا یشمه'' یعنی ممکنات نے تو وجود کی بو بھی نہیں سونگھی اور نہ سونگھے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ علم عین ذات حق ہے۔ اس لیے ممکنات یا اعیانِ ثابت بعلم حق تعالیٰ ہیں اور باطل نہیں بلکہ حق ہیں۔ جیسا کہ آیات قرآن محولہ بالا سے واضح ہوتا ہے۔ اہل علم و حکمت ہمارے زمانہ میں بھی یہی کہتے ہیں کہ چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ گو حق تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اور وہی اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے اور وہی ہر شے پر محیط ہے۔ لیکن کسی اور شے کو بھی اس کی معیت حاصل ہے اور یہ معیت بھی قدیم ہے۔ یعنی گو کائنات حادث ہے لیکن جب تک اس کی اصل قدیم نہ مانی جائے گی، ہستی کی گتھی نہیں سلجھتی۔ چنانچہ اس لیے کہ اگر حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے تو غیب و شہادت کا موجود ہونا ہی واجب ہے۔ عالم اسی صورت میں عالم ہے کہ معلوم اس کے علم میں ہو اور اسی طرح معلوم تب ہی معلوم ہے جب وہ عالم کے علم میں ہو۔ یہ نظریہ میرزا بیدلؒ کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ''ما معلوم حقیم نه علم حق'' یعنی ہم علم حق نہیں بلکہ معلوم حق ہیں۔ شیخِ اکبر اور مرزا بیدل کے نظریہ میں فرق یہ ہے کہ شیخِ اکبر ممکنات کو حق تعالیٰ کی علمی صورتیں کہتے ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ نے جو کچھ چاہا اور ارادہ فرمایا وہی کچھ عین اپنے علم کے مطابق پیدا کیا۔ اس لیے ممکنات عین ذات حق ہیں۔ کیونکہ علم حق عین ذات حق ہے۔ لیکن مرزا بیدل کہتا ہے کہ ہمارے تصورات ہمارے عین نہیں ہیں۔ بہرحال یہ لفظی بحث ہے اور اس میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں حضرات وحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ مرزا بیدل کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ

باطن آنچناں کہ آنچہ اندیشی نیست
ظاہر ایں قدر کہ آنچہ بینی ہمہ اوست

Marfat.com

بہر حال ممکنات خواہ صور علمیہ ہوں یا معلوم حق۔ ان حضرات کی تحقیق کی رو سے ماننا پڑے گا کہ:

(۱) باطل نہیں
(۲) علم حق تعالیٰ سے باہر عدم ہے
(۳) ذاتِ حق سے علیحدہ متصور بھی نہیں ہو سکتے
(۴) اصطلاح میں ذات حق کو قدیم اور ممکنات کو حادث ہی کہا جائے گا۔

ذاتِ حق خالق اور ممکنات مخلوق۔

مرزا بیدل اپنے مخصوص انداز میں ''قدیم'' اور ''حادث'' پر اس طرح بحث کرتے ہیں کہ:

باعتبار بطون نیست ایں جہاں حادث
زپردہ قدم است ایں قدر عیاں حادث

شیون (۱) ذات مندیش قابل تعطیل!
دریں گزر زقدیم است کارواں حادث

حدیث واجب ممکن محیط و موج انگار
وجودِ بحر قدیم است و موجِ آں حادث

چنانکہ لازم حسن است شوخی و خط خال
لوازم قدم اوست ہم چناں حادث

عجب مدار کہ در علم بے نشاں اشیاء
قدیم بود نخیستن شد ایں زماں حادث

ہدانکہ نیست جہاں خالی ازحدوث وقدم
بطوں قدیم شمر ظاہرش ہماں حادث

کلام را بظہور است احتیاجِ زبان
اگر چہ حرفِ قدیم آمد و زباں حادث

ولے بہ پردہ دل حاجت زبانش نیست
کہ رہ نداشت در عالم نہاں حادث

چہ ممکن است کہ حق خلق و خلق حق گردد
نہ ایں قدیم تواند شد و نہ آں حادث

بفہمت آنچہ نیاید حقیقت قدم است
وجود ہر چہ معین بود بداں حادث

بگفتگوئے من و دیگراں مشو قانع
کہ آں چکونہ قدیم است واین چناں حادث

تاملے کہ چہ دارد بروئے کار قدیم
تفکرے کہ چہ آوردہ در جہاں حادث

فنا زعین بقا گل کند محال است ایں
مگر خیال کہ گویند عارفاں حادث

اگر آیات بینات محولہ بالا میں تدبر کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو

(۱): کل یوم ھو فی شان

Marfat.com

جاتی ہے کہ "کل شی ھالک الا وجه" ہر ایک شے ہلاک ہونے والی ہے مگر اس کی "وجہ" باقی رہتی ہے۔ شیخِ اکبرؒ اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ "وجہ" میں ضمیر راجع اسی شے کی طرف ہے۔ اس لیے ہر ایک شے میں باقی رہنے والی اس شے کی حقیقت ہے۔ صورت بدلتی رہتی ہے بلکہ ہر آن فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن حقیقت جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، خود حق تعالیٰ کا علم ہے۔ لیکن علماء ظاہر نے شیخ کی تفسیر پر بہت جرح قدح کی ہے۔ مگر اس میں کچھ قباحت نہیں کیونکہ دیگر آیاتِ قرآن سے بھی یہی کچھ مفہوم ہوتا ہے کہ "ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام" اور تیرے پروردگار کی وجہ باقی رہنے والی ہے جو صاحب جلال واکرام ہے۔ شیخ کے نزدیک "وجہ" سے مراد "وجہٗ رب" ہی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ہر ایک شے کی ربوبیت کون کرتا ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ "اللہ"۔ اس سے تو انکار کسی مسلمان کو نہیں کہ اللہ رب العالمین ہے لیکن یہ بھی تو تسلیم کیا گیا ہے کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ خود سبب نہیں بنتا۔ اس لیے "رب" جو ایک اسم ہے اور "ربوبیت" اس کی صفت ہے، وہ کس طرح ربوبیت فرماتا ہے انہی اسباب سے جو اس نے پیدا کر رکھے ہیں۔ ہوا اور پانی کے ذریعہ ربوبیت فرماتا ہے اور بے شمار دیگر اسباب ہیں جو ہمارے ذہن وشکم کی خواہشات کی تسکین کا موجب ہیں۔ وہ خود تو یہ اسباب نہیں بنتا۔ ان لفظی بحثوں میں الجھنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ صاحب "گلشنِ زار" کہتے ہیں کہ:

"چو ماضی نیست مستقبل مہ وسال چہ باشد غیر ازآں یک نقطہ حال"

زمانہ تین ہیں۔ ماضی و حال و مستقبل۔ ماضی معدوم، مستقبل موہوم۔ البتہ حال معلوم ہے اور حال ایک نقطہ ہے، لیکن نسبتی امور سے جو ان زمانوں میں ہے ہم اسے ایک خط تصور کرتے ہیں جس کی ابتدا ماضی میں اور انتہا مستقبل میں ہے۔

یکے نقطہ ایست وہم گشتہ ساری تو اُو را نام کردہ نہر جاری

صوفیائے محققین کے نزدیک ماضی و مستقبل محض نسبتی امور ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں۔ جو کچھ ہے حال ہی حال ہے، جو شاہد ومشہود ہے۔ اس لیے تمام کائنات ایک "واقعہ واحدہ" ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے کہ:

"یعلم مابین ایدیهم وما خلفهم ولا یحیطون به علماً" (۱۶/۱۵)
"وکان الله بکل شی محیطا" (۵/۱۵)

Marfat.com

"ان اللہ کان بہ علیما" (۵/۱۶)

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک شے ظہور میں آتی ہے۔ مثلاً ایک درخت کا بیج، زمین میں بویا جاتا ہے، پھوٹتا ہے اور رفتہ رفتہ پرورش پاتے ہوئے بڑھتا ہے۔ اس پر بے شمار تغیرات واقع ہوتے ہیں اور کبھی ایک صورت پر اس کو استقلال نہیں۔ یہ سب ایک شے کے ظہور کی صورتیں ہیں، جو ہم پر منکشف ہوتی ہیں اور ہم خود کسی وقت کوئی قابل ذکر شے نہ تھے۔ انسان بنے، طفولیت سے ارذل عمر تک پہنچے اور مر گئے۔ کتنی صورتیں ہیں جو ہر آن فنا ہوتی رہیں۔ ہر ایک مسلمان کا پختہ عقیدہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا بلکہ دوسرے جہان میں منتقل ہو جاتا ہے۔ انسان بھی ایک شے ہے۔ اس لیے اگر "کل شی ھالک الا وجہ" سے حقیقت انسانی ہو تو کیا قباحت لازم آتی ہے؟

ایک شخص لاہور سے کشمیر کی طرف سفر کر رہا ہے۔ راستہ میں وہ جو کچھ دیکھتا ہے اور کشمیر میں پہنچ کر جو کچھ دیکھے گا، وہ فی نفس الامر موجود ہے۔ اس کا پیدا کردہ نہیں۔ اس سیر کے بعد وہ پھر لاہور کی طرف لوٹ آتا ہے جو کچھ اس نے مشاہدہ کیا وہ زمان ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا وہ عدم ہے؟ وہ ایسے ہی موجود ہے اور حال ہی ہے اور جیسا اس نے مشاہدہ کیا۔ اسی طرح کائنات علم الٰہی کے حضور واقعہ واحدہ ہی ہے اور حالیہ ہے۔

ہیئت دان علم ریاضی کے رُو سے بتاتے ہیں کہ کسوف و خسوف فلاں وقت زمانہ مستقبل میں واقع ہوں گے اور ہزاروں سالِ آئندہ کے کسوف و خسوف کے واقعات بتا دیں گے اور ویسے ہی ظہور میں آئیں گے۔ اسی طرح وہ زمانہ ماضی میں جو چاند اور سورج گرہن جس جس وقت ہوئے صحیح بتا دے گا۔ اسی طرح کل کائنات اور وہ واقعات جن کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ ماضی میں رونما ہوئے یا مستقبل میں ہوں گے "حضرت علم" کے نزدیک واقعہ واحدہ ہے۔

تمام حکماء کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ:

عدم وجود گردد ایں محال است

اور حکما طبعین کا یہ کہنا کہ علم و شعور کی اصل کچھ بھی نہیں یہ مادہ کی ارتقائی حالت میں پیدا ہوتے ہیں، اس دعوے کے ہم معنی ہے کہ عدم موجود ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک شے "فعل" میں اسی صورت میں آئے گی جب پہلے ہی "بالقوۃ" موجود ہو۔ جمادات میں وہ سب خواص "بالقوۃ" موجود ہیں جو نباتات اور حیوانات میں "بالفعل"

Marfat.com

مشاہدہ ہوتے ہیں۔ کوئی حکیم یہ نہیں کہے گا کہ ایک درخت عدم سے ہستی میں آیا ہے۔ ہم پر کسی شے کی ہستی کا انکشاف بتدریج ہوتا ہے لیکن ہم مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم کر چکے ہیں کہ ہر ایک شے کا ظہور ایسا ہی ہونا چاہیے جیسی کہ ظہور میں آتی ہے۔ اسی پر کل کائنات کو قیاس کرو تو معلوم ہوگا کہ تمام کائنات واقعہ واحدہ ہے، خواہ ہمیں اس کا احساس اور علم و شعور نہ ہو۔ کسی شے کا عدم علم، علم عدم کے ہم معنی نہیں ہے۔ ہمیں کسی شے کا علم و شعور اسی حالت میں ہوسکتا ہے جب وہ قوت سے فعل میں آئے۔ نیز فعل میں آ کر ہمارے حواس کے سامنے موجود بھی ہو۔ ہم کسی شے کی نسبت جو ابھی تک قوت میں ہے، یہ نہیں کہہ سکتے کہ موجود ہی نہیں۔ اتنا کہیں گے کہ اس کا ظہور ہم پر نہیں ہوا۔ لیکن ''حضرت علم'' میں ہر ایک شے اپنے ہر ایک مرتبہ میں ظہور کر چکی ہے۔ اس لیے تمام کائنات تفصیلاً و مجملاً واقعہ واحدہ ہے۔

اگر ایسی صورت ہو کہ واقعات ایسے ہی ہمارے سامنے رونما ہوں جیسے ماضی میں ہوئے یا مستقبل میں ہوں اور ہم ان کا مشاہدہ حال میں کریں جیسے کسوف اور خسوف کی مثال ہے۔ اس کا امکان ثابت ہوتا ہے تو ہم کسی واقعہ کی نسبت پیش گوئی بھی کر سکتے ہیں جو صحیح ثابت ہوگی اور اگر ہم کائنات میں اسی طرح تصرّف کر سکیں جیسے قانونِ فطرت کارفرما ہے تو گو ناواقف اسے ''کرامات'' سے موسوم کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ''حضرت علم'' کا کرشمہ ہے اور ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ وہ امور جن کو ایام جاہلیت میں ناممکن تصور کیا گیا تھا۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ہمارے احاطہ علم میں آ رہے ہیں اور ممکنات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ناممکن کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ جو شے اس کے احاطہ تصور میں آ جائے مناسب اسباب کے ساتھ اس کا ظہور ممکن ہے۔ ''رب زدنی علما''

=====

Marfat.com

مقالات

کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ یہ تصوف اور فقر کیا ہے؟ فرمایا کہ تصوف نتیجہ بے کاری ہے اور فقر ناداری، چنانچہ موجب افسردگی بیگاری۔

فقر در ہر صفت کہ می نگری　　غیر اسباب نا امیدی نیست
شام اُو چشم بستن است از صبح　　صبح اُو را دمِ سپیدی نیست
آنچہ از ساز دیدہ معدوم　　در نوا ہر قدر شنیدی نیست
می نماید سرا بہا از دُور　　چوں بسر چشمہ وا رسیدی نیست

شیخ شبلی قدس سرہٗ نے بھی فرمایا ہے کہ ''الفقر سواد الوجہ فی الدارین''۔ مطلب ان فقرات کا تو یہ ہے کہ ''کار'' سے مراد ایک نہ ایک مقصدِ حیات ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے لوگ جدوجہد کرتے ہیں۔ اہل دنیا اسبابِ دُینوی کی فراہمی میں مشغول ہیں تو اہل عقبیٰ ثمرۂ زہد و ریاضت و عبادت نعمت جنت یقین کرتے ہیں۔ زاہد و عابد نے ترک دنیا کی اور اہل دنیا نے عقبیٰ، فقیر نے دنیا اور عقبیٰ دونوں کو ترک کر دیا۔

بریدۂ زہمہ باخدا گرفتاراست

مولانا جامیؒ (لائحہ اوّل و دوم میں) فرماتے ہیں کہ

''ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہٖ'' (۲۱/۱۷) حق تعالیٰ نے تجھے نعمت عطا فرمادی ہے، تو تیرے اندر ایک ہی دل رکھا ہے۔ (ہم معتقدِ دعویٰ باطل نہیں ہوتے... سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے) غرض یہ ہے کہ اُسی کی محبت میں یک رُو

و یک دل ہو اور اس کے غیر سے منہ موڑ اور اُسی سے رشتہ جوڑ۔ نہ یہ کہ ایک دل سو (۱۰۰) پارہ اور ہر ایک پارہ ایک ایک مقصد کے لیے آوارہ؛

''یک دل داری بس است یک دوست ترا''

اصطلاحِ تصوف میں ''تفرقہ'' کا مفہوم یہ ہے کہ تعلق امورِ متعددہ کے واسطے سے دل کو پراگندہ کرنا اور ''جمعیت'' یہ کہ مشاہدۂ واحد ہو۔ اہل دنیا نے یہ گمان کیا کہ ''جمعیت'' جمعِ اسبابِ دنیا میں ہے، تفرقۂ ابد میں مبتلا ہو گئے۔ ایک اور فرقہ نے یقین کے ساتھ سمجھ لیا کہ جمع اسباب ہی اسبابِ تفرقہ ہے۔ ہر ایک شے سے دست بردار ہو گیا۔

اے در دل تو ہزار مشکل زہمہ　　مشکل شود آسودہ را دل زہمہ
چوں تفرقہ دل ست حاصل زہمہ　　دل را بہ یکی سپارد بگسل زہمہ
اے سالک رہِ سخن زہر ماب مگو　　جز راہِ اصول رب ارباب مپو
چوں علت تفرقہ ست اسباب جہاں　　جمعیت دل زجمع اسباب مجو

بیدلؒ کا ارشاد ہے کہ:

چہ دنیا وچہ عقبٰی سد راہ تست اے غافل
بیا بگذر کہ از بہر گذشتن ہاست حایل ہا

...

بہشت وکوثر از حرص و ہوس لبریز می باشد
بعقبٰی ہم رسیدم جز ہمیں دنیا نشد پیدا

...

حرص ہر سورہ برو بر سیم و زر دارد نظر
زاہد از فردوس ہم مطلوب جز دنیا نہ داشت

طمع انسان کو ہر ایک طرف لے جا رہی ہے اور انسان مارا مارا پھرتا ہے اور حریص کی نظر سونے اور چاندی پر ہی رہتی ہے یعنی وہ جو بھی کام کرتا ہے، اس کا مقصد زر اندوزی ہی ہوتا ہے۔ زاہد جنت کا طالب ہے۔ مجاہدہ اور ریاضت سے جنت حاصل کرنا

چاہتا ہے۔ جنت کی نعمتیں یہی کچھ ہیں جو دنیا میں موجود ہیں۔ حور قصور، تو دراصل اس کا زہد بھی دنیا طلبی ہے۔ وہ طالب حق نہیں ہے۔

حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے

آسودگی از ما دو جہاں فاصلہ دارد دنیا الم غفلت و عقبیٰ غم اعمال

دنیا اور آخرت دو جہان ہیں اور ان دونوں جہانوں میں آسودگی میسر نہیں۔ دنیا غفلت کا گھر ہے۔ اس کا غم ہمیں رہتا ہے اور عقبیٰ کا فکر دامن گیر اس لیے ہوتا ہے کہ اعمال کی جزا و سزا اسی دار مکافات میں ملے گی۔ اس لیے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جسے آسودگی کہتے ہیں وہ ہم سے اتنی دور ہے جتنا دو جہانوں کا فاصلہ۔ ''راحت'' ان سے پرے ہے اور وہ ''وحدت'' میں ہے۔ اس لیے خوف و رجا جس میں جہنم اور جنت کا تصور کارفرما ہے، سراسر دردسر ہی ہے۔ اللہ کے بندے وہ ہیں کہ ''لاخوف علیھم ولاھم یحزنون''۔

المختصر تصوف تو یہی کچھ ہے۔ لیکن یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ ہر ایک شے کی قیمت بقدر جنس ہے۔ اہل دنیا، دنیا کے لیے کتنی محنت و مشقت برداشت کرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ یہ گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ اہل آخرت دنیا کی لذتوں کو اس امید پر ترک کرتے ہیں کہ آخرت میں اس سے بڑھ کر نعمت ملے گی، جو جاودانی ہے اور یہ ریاضت شاقہ اور مجاہدہ حاقہ کرتے ہیں۔ طالب حق کو دنیا اور آخرت دونوں ترک کرنی پڑیں گی۔ اس لیے قیاس ہوسکتا ہے کہ اس کو کیا کچھ اہل دنیا و آخرت سے بڑھ کر کرنا ہے۔

اہل حق نے تصوف اور صوفی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ صوفی کسے کہتے ہیں۔ ابوالحسن نوریؒ کہتے ہیں کہ ''لیس التصوف رسوماً ولا علوماً ولکنہ اخلاق'' یعنی تصوف رسوم اور علوم نہیں ہیں لیکن وہ صرف اخلاق ہے۔ اگر تصوف کچھ رسمیں ہوتیں تو مجاہدہ سے حاصل ہوسکتی تھیں۔ اگر علوم ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہو جاتا۔ لیکن وہ اخلاق ہے۔ رسم تو اس کو کہتے ہیں جو فعل بے حقیقت ہو اور اسباب کے ساتھ بے تکلف ظہور میں آئے۔ جیسے عوام کی نمازیں جو رسماً ادا کی جاتی ہیں اور حقیقت کے اثر سے خالی ہوتی ہیں۔ خلق ایسا فعل ہے جو بلاتکلف و اسباب ظاہر و باطن کی موافقت کے ساتھ ظہور میں آتا ہے۔

Marfat.com

حضرت مرتعشؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ ''التصوف حسن الخلق، ''تصوف نیک خلق ہے۔ حسن الخلق ایک تو اللہ سے ہوتا ہے کہ بغیر رُو و ریا اور بغیر لامتہ لائم احکام الٰہی کی تعمیل کی جائے جس میں حرص و ہوا کو دخل نہ ہو۔ دوسرے بندگانِ خدا سے حسن سلوک بوجہ اللہ ''لانرید منکم جزاءً ولا شکوراً ''(۲۹/۱۹) اس سلوک میں بندگانِ خدا سے نہ تو کسی معاوضہ کی طمع ہو اور نہ ان کی طرف سے شکر گزاری کی اور تیسرا وہ سلوک جو صوفی اپنے نفس سے کرتا ہے۔ یعنی نفس امارہ کی خواہشات سے پرہیز کرے اور اس کو اطمینانِ قلب کے مقام پر لے آئے۔ یعنی اس کا نفس، نفسِ مطمئنہ ہو جائے اور یہ ذکرِ الٰہی ہی سے ممکن ہے جو ہر حال و مکان میں ہو، اور صوفی کبھی غافل نہ ہو۔

حضرت ابوعلی قزوینی کہتے ہیں کہ ''التصوف هو الاخلاق الرضیه ''یعنی تصوف پسندیدہ اخلاق کو کہتے ہیں۔ پسندیدہ اخلاق وہ ہیں جو ''فطرت الله التی فطر الناس علیها'' (۷/۲۱) کے نزدیک پسندیدہ ہوں۔

محمد بن احمد المکرّی فرماتے ہیں: ''التصوف استقامة الاحوال مع الحق '' تصوف اہل تصوف کے حالات کے حق تعالیٰ کی معیت کے ساتھ درستی اور راستی ہے۔ یہ استقامت حالات اعلیٰ مقام ہے اور شاید اس دنیا میں اس سے اعلیٰ مقام متصور نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ''ما زاغ البصر وما طغیٰ ''(۲۷/۵) نہ تو نظر میں کجی واقع ہوتی ہے اور نہ اپنے اصلی مقام سے اِدھر اُدھر ہٹتی ہے۔

علی بن بندار الصیرنی نیشاپوریؒ فرماتے ہیں ''التصوف اسقاط الرویة للحق ظاهراً و باطناً ''یعنی تصوف یہ ہے کہ صوفی اپنے آپ کو ظاہر و باطن میں نہ دیکھے، صرف مشاہدہ حق ہو۔ لیکن حضرت ابوبکر شبلیؒ اس سے ایک قدم اور آگے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ''التصوف شرک لانّه صیانة القلب عن رویة الغیر ولاغیر ''۔ تصوف شرک (خفی) ہے کیونکہ وہ دل کو غیر کے دیکھنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ حالانکہ غیر کا وجود ہی نہیں۔ اس حقیقت کا علم کہ غیر کا وجود ہی نہیں مبتدی تصوف ہی سے سیکھتا ہے جب اس کو اس کا علم ہو گیا تو پھر تصوف کیا، تمام علوم اس کے لیے بے کار ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ''الصوفی اذا نطق بان نطقه من حقائق وان سکت نطقت عنه الحوائج یقطع العلائق، ''صوفی جب گفتگو کرتا ہے تو

اس کا کلام اس کے حال کی حقیقت واضح کرتا ہے اور اگر خاموش رہتا ہے تو اس کے اعضاء ہی زبانِ حال سے اس کے قطع علائق کی شہادت دیتے ہیں۔ یعنی صوفی کا حال اس کے حال کے بالکل مطابق ہوتا ہے اور خاموشی کی صورت اس کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ وہ دنیوی تعلقات سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ وہ جو کچھ کہے گا حق ہوگا اور اس کا عمل اس کے فقر پر شہادت دے گا۔

اسی قبیل کے اقوال اکابر صوفیہ کے ہیں۔ فہم و تفہیم کے لیے یہی کافی ہیں۔ اسلام میں تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ دیگر مذاہب میں تصوف پایا جاتا ہے لیکن تصوف فی الاسلام اور دیگر مذاہب کے تصوف میں فرق یہ ہے کہ مؤخرالذکر میں قطع علائق سے مراد تمام دنیوی کاروبار ترک کر دینا بلکہ تمام عمر تجرید میں بسر کرنا اور اپنے جسم کو ہر ایک ممکن اذیت دینا۔ یہ بات مسیحی رہبانیت اور بدھ مت اور ہندوستان کے تپسویوں میں اب بھی پائی جاتی ہے۔ اسلام میں یہ بات نہیں۔ اسلامی تصوف یہ ہے کہ دنیا میں دنیاداروں کی طرح رہنا، دنیوی کاروبار کرنا اور اس پر بھی سب سے بے تعلق رہنا جو ایک ذہنی کیفیت ہے، دنیا کی محبت اس کو نہیں ہوتی۔ خدا کی محبت میں وہ مستغرق ہوتا ہے۔ ''دل بیار و دست بکار''۔

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود زہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است
(حافظؒ)

میں اس شخص کی ہمت مردانہ کا بندہ ہوں کہ ہر ایک ایسے امر سے،
جس سے تعلق کا رنگِ دل پر ہو، آزاد ہے۔

ایک دفعہ ہارون الرشید خلیفہ عباسیہ نے محل میں سلطنت کی نادر اشیاء قرینہ لگا کر تمام امرا و وزرا اور لونڈیوں اور غلاموں کو دعوت دی کہ اس محل میں جو چاہے ایک شے اپنی پسند کی اٹھا لے، اُسی کی ہے۔ ہر ایک نے ایک ایک چیز اٹھا لی، لیکن ایک لونڈی خاموش کھڑی رہی۔ ہارون نے پوچھا کہ کیا تجھے کوئی شے اس محل میں پسند نہیں۔ لونڈی نے عرض کی کہ جہاں پناہ ہر ایک شے پسندیدہ ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ حضور نے جمع فرمائی ہیں۔ لیکن حضور نے فرمایا ہے کہ ہر ایک چیز جو بھی اس محل میں ہے پسند کر لو۔ میری نگاہِ انتخاب تو آپ پر پڑتی ہے۔

یہ حقیقت بھی اچھی طرح دل نشین کر لینی چاہیے کہ ہم سب اسی دنیا میں پیدا کیے گئے ہیں اور اس کرۂ ارض پر ہمارا مستقر کچھ عرصہ زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کی بھی کچھ غرض و غایت و حکمت ہے۔ دنیا دار ہوں یا اہل عقبیٰ یا اہل اللہ، سب کو اِسی دنیا میں رہنا ہے اور اِسی دنیا میں رہ کر کچھ کام بھی کرنا ہے، خواہ یہ سراسر آزار ہی ہو۔

مدعا از ہستی ما بس ہمیں آزار بود ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

اہل دنیا و عقبیٰ کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ اہل اللہ بھی اسی دنیا میں رہتے آئے ہیں اور جو کچھ وہ عمل کرتے رہے، تذکروں میں مذکور ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کیا ہے؟ خدا سے غافل ہونا، نہ کہ دنیا کا مال اور فرزند اور عورت

اور ہمارے صوفی صافی شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ:

بہ بیں آں بے حمیت را کہ ہرگز نخواہد وید روئے نیک بختی

اس بے غیرت کو دیکھ جو کبھی نیک بختی سے دوچار نہ ہوگا

تن آسانی گزیند خویشتن را زن و فرزند بگزارد بسختی

اپنی تن آسانی کے لیے اہل و عیال کو سختی میں ڈال رکھا ہے

تصوف بس اتنا ہی ہے کہ اس بحر دنیا میں رہتے بطخ کی طرح پیرتے رہو، غوطے لگاؤ مگر جب اس سے باہر آؤ تو تمہارا دامن تر نہ ہو۔ ہر وقت اور ہر جگہ ''قیاماً و قعوداً و علی جنوبِ'' باخدا ہو، ارشادِ قرآن ہے کہ:

''رجال لا تلھیھم تجارۃ و لابیع عن ذکر اللہ''

ایسے لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔ (۱۸/۱۱)

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں دو دفعہ سخت حیران ہوا۔ ایک شخص کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور وہ سخت غافل تھا۔ حیران ہوا کہ اللہ کے گھر میں اور اللہ کی یاد سے غافل؟ دوسری دفعہ ایک کپڑے کے تاجر کو بخارا میں دیکھا تمام دن خرید و فروخت میں مشغول مگر ایک دم بھی یادِ خدا سے غافل نہ تھا!

Marfat.com

جنہیں اہل شریعت تکالیف شرعیہ کہتے ہیں وہ اہل اللہ ذوق وشوق سے ادا کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ محبوب کی محبت ہی میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جو بات محبوب پسند کرتا ہے وہی بے تکلف کی جائے اور جس میں ذوق وشوق ہو وہ نہ صرف طبیعت پر بار نہیں ہوتی بلکہ انسان اس پر حریص ہوتا ہے۔جس کام کی الفت ہو، وہ ناگوارِ خاطر کیوں ہو؟

تصوف سے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہو چکی ہے۔میرا یہ منصب نہیں کہ اس کا ازالہ کروں۔

ترسم آں قوم کہ بر دردکشاں می خندند   در سر کار خرابات کنند ایماں را

غلطی کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ اصل تو پوشیدہ ہے اور نقل متاعِ بازار ہے۔پیری و مریدی کی دکان میں وہ جنس تو نہیں ملتی جسے تصوف کہتے ہیں۔اس لیے اہل نظر بدگماں نہ ہوں تو کیا ہوں؟ معذور ہیں۔علاوہ ازیں ہم نے اس مقالہ میں تاریخ تصوف بیان کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس میں ایسے عقائد بھی داخل ہو گئے ہیں جو شرک وکفر و زندقہ ہیں اور جب ان کا ظہور ایسے حضرات سے ہو جو تسبیح وسجادہ و دلق سے لوگوں کی توجہ جذب کرتے ہیں تو قیاس ہو سکتا ہے کہ تصوف کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔مگر اہلِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ دلق اگر لباس ریا ہے تو گودڑی میں لعل کا بھی امکان ہے۔افسوس ان حضرات پر ہے کہ جو اہل علم وفضل ہیں وہ بھی تصوف کی مذمت میں پیش پیش ہیں۔سید عباس علی نے ایک مثنوی ''من وسلویٰ'' لکھی۔غالباً اس کا پھیکا پن بنی اسرائیل کی طرح محسوس کیا ہوگا کہ فرماتے ہیں:

در تصوف می شود شیریں کلام   زانکہ باشد در گنہ لذت تمام
ایں کلام صوفیان شوم نیست   مثنوی مولویٔ روم نیست

قبول خاطر ولطف سخن خداداد است، مثنوی معنوی کو جو قبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ واعظانِ شہر بھی برسر منبر مزے لے لے پڑھتے ہیں۔مولانا جامیؒ کہتے ہیں کہ:

مثنویٔ مولوی معنوی   ہست قرآن در زبان پہلوی
من چہ گویم وصف آں عالی جناب   نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

Marfat.com

میں تو سمجھتا ہوں کہ بہترین تفسیر قرآن ہے۔ من وسلویٰ کو آج کوئی جانتا بھی نہیں اس سے تو طالب آملی کا ''نان وحلوا'' زیادہ مرغوب ہے۔

تصوف کا خاص موضوع ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' ہے۔ جو حضرات ''خودشناسی'' کے فلسفہ سے آگاہ ہیں وہ بھی تصوف میں افسردگی محسوس کرتے ہیں۔ ''فکر ہر کس بقدرِ ہمت اُوست''۔

اس مقالہ کے مطالعہ کے بعد امید ہے کہ اہل تحقیق پر تصوف کی حقیقت واضح ہو جائے گی، کم از کم یہ حقیقت جو مجھ پر منکشف ہوئی ہے، جس کی تائید اس طایفہ کے اکابر کی تصانیف سے ہوتی ہے۔ چند ائمہ تصوف کے کچھ اقوال ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

یہ اقوال ایک تو عبادت کے بارہ میں ہیں جن کا تعلق خدا سے ہے اور دوسرے حسن معاملات یا خلق خدا اور لسان قرآن میں صلوٰۃ وزکوٰۃ سے موسوم ہیں۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں، کسی شے کی کجی کو حرارت سے سیدھا کرنا۔ اس کا صحیح ترجمہ ہندی میں ''تپ'' یا ''تپیا'' ہے اور زکوٰۃ کے معنی تزکیہ نفس، چونکہ کج رَوی چھوڑ کر سیدھی راہ اختیار کرنا اور تزکیہ نفس کا نتیجہ ارتقا ہے، اس لیے صلوٰۃ وزکوٰۃ کی غرض وغایت بھی یہی کچھ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسنِ معاملات یا خلق خدا لوجہ اللہ ہی ممکن ہے۔

دو ہی باتیں ہیں، ایک علم اور دوسرا عمل۔ امام غزالیؒ ''منہاج العابدین'' میں کہتے ہیں کہ عمل خواہ عبادت سے تعلق رکھتا ہو یا معاملات سے، بے علم مفید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین طلب علم میں مبالغہ کرتے اور تمام کاموں میں سے اول کار علم اختیار کرتے۔ پس علم عبادت پر مقدم ہے اور تقدیم علم عمل پر ارشادِ قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ:

''انما یخشی اللہ من عبدہ العلما'' (۲۶/۱۶)

خشیت اور تعظیم وتکریم وتحریم حق تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور تمام طاعات ثمرہ علم ہی ہیں اور علم ہی تمام معاصی سے باز رکھ سکتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت علم ہی سے ممکن ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

''طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ''

ہر ایک مسلمان مرد وزن پر طلب علم فرض ہے

چونکہ قرآن وحدیث میں علم کو ہر ایک شے سے افضل بتایا گیا ہے اس لیے

Marfat.com

ہجرت نبوی کے بعد سات سو سال تک مسلمانوں کی توجہ طلب علم کی طرف زیادہ سے زیادہ رہی اور ان ایام میں مسلمانوں میں ایسے بلند پایہ اشخاص پیدا ہوئے جو ہر ایک علم میں اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ اہل تصوف کو تو اس سے خاص شغف تھا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم یہی کچھ آیات واحادیث واقوالِ ائمۂ تصوف اس مقام پر درج کریں تا کہ طالبانِ حق اس کی اہمیت سمجھیں اور صحیح معنی میں مسلمان بننے کی کوشش کریں۔

(۱) قرآن کا ایک نام ''العلم'' ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی دعا وحیاً سکھائی گئی کہ ''قل ربِ زدنی علما''۔

(۲) ''یوتی الحکمة من یشاء ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً'' جس کسی کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوئی تو تحقیق اس کو خیرِ کثیر عنایت ہوئی۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر آدمی حکمت کا ایک کلمہ سیکھے تو اس کے حق میں دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔

(۴) فضل اور عقل والوں میں علم ایک قرابت قریبہ ہے۔ (امام شافعیؒ)

(۵) علم دو ہیں۔ ایک ''علم علی اللسان'' یہ اللہ کی اولاد آدم پر حجت ہے اور دوسرا ''علم فی القلب'' یہ علم نفع بخش ہے۔ (حدیث ترمذی)

(۶) آخر زمانہ میں عابد جاہل ہوں گے اور علماء فاسق۔ (حدیث۔ حاکم)

(۷) علم کو اس غرض سے مت سیکھو کہ اس سے علماء کے ساتھ فخر کرو اور جاہلوں سے بحث کرو اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرو، جو کوئی ایسا کرے گا دوزخ میں جائے گا۔ (حدیث ابن ماجہ)

(۸) مجھ کو امت مسلمہ میں زیادہ تر خوف منافق علم والے کا ہے۔ منافق علم والا وہ ہے جو زبان کا علیم ہو اور دل اور عمل کے لحاظ سے جاہل۔ (حضرت عمرؓ)

(۹) تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو علم اور ظرافت کو مثل علماء وحکما کے رکھتے ہیں اور عمل میں بے وقوفوں کے برابر ہیں۔ (حسن بصریؒ)

(۱۰) دنیا میں سب سے بڑھ کر ندامت اس شخص کو ہوتی ہے جو ایسے شخص پر احسان کرے جو اس کا مشکور نہ ہو اور موت کے وقت اس عالم کو جس نے عمل میں

Marfat.com

کوتاہی کی۔ (ابراہیم بن عقبہ)

(۱۱) آدمی چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ کہ واقع میں عالم ہے اور اس کو اپنے علم کا شعور ہے۔ یہ شخص عالم ہے اس کا اتباع کرو، اور دوسرا وہ کہ عالم ہے مگر اس کو اپنے علم کا شعور نہیں۔ یہ سویا ہوا ہے، اس کو بیدار کرو۔ اور تیسرا وہ کہ نہیں جانتا اور اس کو اس کا شعور ہے کہ نہیں جانتا۔ یہ شخص ہدایت کے قابل ہے اس کو ہدایت کرو۔ اور چوتھا وہ کہ نہیں جانتا اور اتنا شعور بھی نہیں کہ نہیں جانتا، تو وہ جاہل ہے اس کو ترک کرو (خلیل بن احمد)

اس پر بعض بزرگوں نے اتنا اور زیادہ کہا ہے کہ ایک شخص کو علم سے بہرہ نہیں اور زعم ناقص میں سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوں، وہ بہائم سے بدتر ہے۔ اس کی صحبت سے کنارہ کرو۔

(۱۲) علم عمل کو پکارتا ہے۔ اگر عمل نے لبیک کہا تو خیر، ورنہ علم رخصت ہو جاتا ہے۔ (سفیان ثوریؒ)

(۱۳) آدمی جب تک طلب علم میں رہتا ہے تب تک عالم ہے اور جب یہ گمان کرتا ہے کہ میں علم حاصل کر چکا ہوں، جاہل بن جاتا ہے۔ (ابن مبارکؒ)

(۱۴) مجھ کو تین شخصوں پر رحم آتا ہے۔ ایک وہ کہ قوم میں معزز تھا ذلیل ہو گیا۔ ایک وہ کہ قوم میں تونگر تھا، مفلس ہو گیا اور ایک وہ کہ عالم تھا جس سے دنیا کھیل رہی تھی۔ (فضیل بن عیاض)

(۱۵) علماء بد کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر نہر کے دہانہ پر رکھ دیا جائے کہ نہ خود پئے اور نہ پانی کو بہنے دے کہ لوگ اور زمین سیراب ہوں، یا ایسی قبریں ہیں کہ باہر سے پختہ اور چونہ اور گچ سے آراستہ اور اندر ہڈیاں اور بدبو۔ (حضرت عیسیٰ، انجیل)

(۱۶) جتنا چاہو علم سیکھو، اللہ تعالیٰ ثواب ہرگز نہ دے گا جب تک عمل نہ کرو گے، اس لیے کہ بیوقوفوں کا مقصود علم سے روایت کرنا ہے اور علماء کی غرض رعایت اور پاس داری ہے۔ (حسن بصریؒ)

(۱۷) علم کثرت روایت سے نہیں ہوتا، بلکہ خوفِ خدا ہے۔ (حضرت ابن مسعودؓ)

(۱۸) علم خوفِ خدا ہے۔ (حضرت سلیمان علیہ السلام)

(۱۹) زیادہ عالم وہ ہے جو زیادہ خوف خدا رکھتا ہو (حدیث طبرانی، ابن انسی، دارمی)

(۲۰) قرآن علم ہے، اور اس لیے نازل ہوا کہ اس کے ساتھ عمل کرو اور عمل کرنا سکھاؤ۔ تم نے صرف پڑھنے پڑھانے کو عمل ٹھہرا لیا اور عالم جو عمل نہیں کرتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے بیمار، کہ دوا کی صفت بیان کرے اور استعمال نہ کرے یا بھوکا شخص کہ لذیذ کھانوں کے نام لے لے کر چٹخارتا رہے اور کھانے کو نہ ملے، انہی کے حق میں ہے، "ولکم الویل مما تصفون" (حضرت ابن مسعودؓ)

(۲۱) جن چیزوں سے میں اپنی امت سے ڈرتا ہوں ان میں سے عالم کی لغزش ہے۔ (حدیث ابو درداؓ، طبرانی)

(۲۲) بدترین علماء وہ ہیں جو امیروں کے پاس جاتے ہیں، اور بہترین امیر وہ ہیں جو علماء کے پاس آتے ہیں۔ (حدیث ابو ہریرہ، ابن ماجہ)

(۲۳) اے سلمہ امیروں کے پاس مت جانا کیونکہ تم کو ان کے دُنیوی مال سے تب ہی کچھ ملے گا جب وہ تمہارے دین سے بہتر وصول کر لیں گے۔ (حضرت ابوذر غفاریؓ)

(۲۴) آپ (عمر بن عبد العزیزؒ) نے دریافت کیا کہ میں آپ کو ایسے لوگوں کا پتہ بتاؤں جو اللہ تعالیٰ کے امر میں آپ کی مدد کریں؟ جواب یہ ہے کہ اہلِ دین تو تمہارے پاس آنے کو نہیں اور دنیا والوں سے آپ کو غرض نہیں۔ تاہم تم اشراف کو اپنے ساتھ رکھو وہ شرف کو خیانت کی آلودگی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(۲۵) عالم تین ہیں۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے امر سے واقف ہیں مگر اس کے ایام یعنی عتوبات ظاہری باطنی نعمتوں سے ناواقف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ حلال اور حرام میں حکم کرتے ہیں۔ ایسا علم خوف خدا کا مورث نہیں ہوتا۔ ایک وہ کہ خدا کو جانتے ہیں اور اس کے امر اور ایام کو نہیں جانتے، یہ لوگ عوام ایمان دار ہیں، اور ایک وہ کہ اللہ کو بھی جانتے ہیں اور اس کے امر اور ایام کو جانتے ہیں۔ یہ صدیق ہیں اور خوف اور فروتنی صرف اُنہی پر غالب ہوتی ہے۔ (سہیل تستریؒ)

(۲۶) علم سیکھو اور علم کے لیے وقار اور علم کو سیکھو اور جس شخص سے سیکھتے ہو اس سے بہ تواضع پیش آؤ اور جو شخص تم سے سیکھے چاہیے کہ تم سے فروتنی کرے۔ (حضرت عمرؓ)

(۲۷) علماء سے جابر مت بنو کہ تمہارا علم جہل کے برابر نہ ہو۔ (حضرت عمرؓ)

Marfat.com

(۲۸) اللہ تعالیٰ جس کو علم دیتا ہے اس کے ساتھ حلم اور فروتنی اور خوش خلقی اور نرمی بھی دیتا ہے، مفید علم اسے کہتے ہیں۔ متقیوں کا امام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ علم کے ساتھ زہد اور تواضع اور حسن خلق عنایت فرمائے۔ (لا اعلم ماخوذ از ''احیا العلوم الدین'')

(۲۹) حلم علم کا وزیر ہے، نرمی اس کا باپ ہے، تواضع اس کا لباس۔ (حسن بصریؒ)

(۳۰) جو شخص علم سے ریاست کا طالب ہے، اللہ کا تقرب اس سے عداوت رکھتا ہے۔ (بشر بن حارثؒ)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ صلوٰۃ کی غرض تو یہی ہے کہ بے حیائی اور نامعقول باتوں سے روکتی ہے جو لوجہ اللہ ہی ممکن ہے اور زکوٰۃ کا مقصد بھی پاکیزگی ہے۔ اس لیے تصوف میں اسی طہارت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اول، ظاہر بدن کو نجاست سے پاک رکھنا، دوسرے اعضا کو گناہوں سے پاک کرنا، تیسرے دل کو خصائل ذمیمہ سے پاک رکھنا، چوتھے باطن کو اللہ تعالیٰ کے ماسوائے ذکر وفکر سے پاک رکھنا۔

(۱) فیہ رجال یحبون ان یتطھروا، واللہ یحب المطھرین۔ (قرآن)

اس میں آدمی ہیں جو پاک رہنے سے خوش ہیں اور اللہ پاک لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔

(۲) الطھور شطر الایمان (حدیث)

(۳) بنی الدین علی النظافۃ (حدیث)

(۴) لایمسہ الا المطھرون (قرآن)

صحیفۂ فطرت اور قرآن کے مطالب سے صرف پاک دل ہی واقف ہو سکتے ہیں۔

توکل

تصوف میں چند امور کا خاص خیال رکھا گیا ہے: توکل، تفویض، رضا، صبر، توبہ، اخلاق وغیرہ۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ ان کی اضداد کا علم ہو تا کہ ان سے بچے: سخط (غصہ) طول امل، حسد، ریا، کبر، عُجب وغیرہ۔ ان سے پرہیز کرنا اصطلاح میں ''تقویٰ'' سے تعبیر ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مستقل موضوع ہے۔ اور توکل وغیرہ کے دقائق سمجھنے کے لیے اسی علم کی ضرورت ہے، جس کا مذکور اشارۃً ہو چکا۔ ان کے بارہ میں جو کچھ آیات بینات اور احادیث اور اقوالِ ائمہ تصوف ہیں اگر انہیں نقل کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہوگا۔

چند ایک کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ ''احیاء العلوم الدین'' میں ''توحید اور توکل'' کے تحت لکھتے ہیں کہ توکل منازلِ دین میں سے ایک منزل ہے اور مقاماتِ یقین میں سے ایک مقام، بلکہ مقربین کے درجاتِ عالیہ میں سے ایک مرتبہ ہے اور علم دقیق اس لیے ہے کہ اسباب کا لحاظ کرنا اور ان پر تکیہ کرنا توحید میں شرک ہے اور اگر ان سے بالکل تساہل اور سستی کی جائے تو سنت پر طعن اور احکامِ شریعت پر اعتراض وارد ہوتا ہے اور اسباب کا لحاظ نہ کرنا اور ان پر تکیہ نہ کرنا، قیاس میں مشکل سے آتا ہے، بلکہ ورطۂ جہالت میں پھنساتا ہے۔ اس لیے تقاضائے علم یہ ہے کہ توکل کے معنی اس طرح سمجھنے چاہئیں کہ توحید کے بھی موافق ہو اور عقل و شرح کے بھی مطابق ہوں۔ یہ بات نہایت باریک اور مشکل ہے۔ اس بات کو وہی علماء سمجھ سکتے ہیں جن کے دیدۂ بصیرت میں اللہ کے فضل سے حقائق کا نور سمایا ہوا ہے۔ آیاتِ ذیل میں تدبر کرنا چاہیے۔

(۱) ''وعلى الله فتوكلو ان كنتم مومنين ''۔ اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

(۲) ''ومن يتوكل على الله فهو حسبه '' اور جو اللہ پر بھروسا کرے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

(۲) ''وعلى الله فليتوكل المتوكلون '' اور بھروسہ کرنے والے کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

(۳) ''ان الله يحب المتوكلين '' تحقیق اللہ توکل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

(۴) ''اليس الله بكاف عبده'' کیا اللہ کافی نہیں اپنے بندے کے لیے؟

امام غزالیؒ نے ''توکل'' پر جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ انسان جو بھی کام کرتا ہے تو اپنے اختیار سے کرتا ہے اور مدنظر کچھ مقصد ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ کسی نفع بخش شے کا حاصل کرنا، جس کی اسے ضرورت ہے اور سر دست اس کے پاس نہیں ہے۔ مثلاً مال کی طلب۔ دوسرے جب ایسی نفع بخش شے حاصل ہو جائے تو اس کی حاجت کرنا تاکہ ضائع نہ ہو اور بوقت ضرورت کام آئے۔ تیسرے ہر ایک ایسی شے کو جس کو وہ مضر اور ایذا رساں سمجھتا ہے، دفع کرنا۔ چوتھے جو مصائب اور آلام وارد ہو چکے ہیں، ان سے نجات

Marfat.com

حاصل کرنا۔ اب دیکھنا یہ ہے، کہ نفع بخش اشیاء واسباب کیا ہیں؟ یعنی کن ذرائع اور وسائل سے حاصل ہوسکتی ہے؟ یہ تین قسم کے ہیں۔ ایک یقینی، دوسرے ظنی، تیسرے وہمی۔ یقینی اسباب وہ ہیں جو مشیت الٰہی اور سنت اللہ سے وابستہ ہیں اور ان میں تبدل وتغیر کبھی واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً آدمی کو تشنگی وگرسنگی ہوتی ہے اور جانتا ہے کہ پانی اور خوراک سے اس کی شدت رفع ہوکر تسکین حاصل ہوگی۔ اگر آب و نان کے لیے کوشش نہ کرے اور اگر کسی طرح میسر ہوتو ہاتھ نہ بڑھائے اور نہ منہ میں ڈالے اور نہ اتنی کوشش کرے کہ پیٹ میں جائے اور یہ کہے کہ میں متوکل ہوں؛ ایسا شخص جاہل دیوانہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خواہش کرے کہ رزق خود بخود اس کے پاس آجائے اور پھر جو کام دانتوں اور معدہ کا ہے، وہ بھی کوئی فرشتہ ہی کرے تو ایسا شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی سنت اور عادت کے خلاف سب کچھ ہوتا رہے۔ زمین سے رزق پیدا ہوتا ہے اور ایسا شخص یہ چاہے کہ نہ زمین میں ہل چلائے اور نہ بیج ڈالے، خود بخود فصل گندم پیدا ہو اور آٹا بن کر روٹی کی صورت اختیار کرلے تو یہ شخص نظام کائنات کو بدلنا چاہتا ہے اور وہ بھی محض اپنے آرام اور آسائش کے لیے؛ تو ایسی باتیں احمق جنون زدہ لوگوں کی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے عقائدِ فاسدہ اور خیالاتِ باطلہ دشمنانِ دینِ متین نے جو زندیق ہیں مسلمانوں میں شائع کیے، تاکہ یہ لوگ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں اور تنازعہ للبقا کے راز سے واقف نہ ہوں اور بآسانی مغلوم ومحکوم ہوجائیں۔ ایسی لایعنی باتوں کا تصوف سے کچھ تعلق نہیں۔ توکل حال اور علم سے ہونا چاہیے۔ علم اس حقیقت کا اللہ تعالیٰ کی سنت مشاہدہ کرچکا ہے جو تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے کے افعال وحالات میں کارفرما ہے اور جانتا ہے کہ سنت اللہ جس کو عرفِ عام میں قوانین فطرت کہتے ہیں، ہرگز کبھی تبدیل وتحویل نہیں ہوتے۔ ان پر ان کا پختہ ایمان ہونا چاہیے اور حال یہ ہے کہ اس ایمان کے مناسب اس کے اعمال بھی ہوں اور ایسے سکون دل کے ساتھ کامل یقین ہو کہ اس کے اعمال ضائع نہیں ہوسکتے۔ اور یہ کہ اعمال کی توفیق بھی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔ جیسے اسباب اسی کے پیدا کردہ ہیں اور اعمال کے نتائج جیسے اس نے مقرر کردیئے ہیں، اُسی طرح ظہور میں آرہے ہیں۔ اس طرح وہ شخص بالکل اپنے آپ کو اللہ اور اس کی سنت کے تابع کرتا ہے اور اس کے منشا کو سمجھتا ہے اور اس کا رخ بھی ادھر ہی ہوتا ہے جس طرف منشاء فطرت ہے۔ توکل اس حالت میں صحیح ہے جبکہ وہ شخص

اپنے زورِ بازو اور اسباب کے خواص کو جوہر ذاتی نہیں سمجھتا اور یہ یقین کرتا ہے کہ سب کچھ دیا ہوا اللہ ہی کا ہے، وہ چاہے تو بازو میں زور نہ رہے اور اسباب موافق نہ ہوں۔ بہر حال یقینی امور پر توکل خود بخود ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، لیکن ایسے امور جو یقینی نہیں ان پر توکل کیسے کیا جائے؟ مثلاً ایک شخص سفر میں ہے اور زادِ راہ اس کے پاس نہیں اور اس لیے زادِ راہ نہیں رکھتا کہ خیال کرتا ہے کہ یہ توکل کے خلاف ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ راستہ میں اگر خورونوش کا مناسب انتظام نہ ہوا تو وہ تکلیف اٹھائے گا۔ اگر اسے خیال ہے کہ ممکن ہے کہ راستہ میں کوئی سبیل خورونوش کی نکل آئے لیکن وہ کیوں ایک امر موہوم پر بھروسا کرتا ہے۔ تقاضائے عقل یہی ہے کہ زادِ راہ اپنے ساتھ لے، پھر توکل کرے۔ اس کا امکان ہے کہ زادِ راہ ضائع ہو جائے لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زادِ راہ ساتھ لے۔ اگر وہ ضائع ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حالات پر اس کا اختیار نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا ہے کہ ''وتزوّدوا فان خیر الزاد التقویٰ، واتقون یاولی الالبـــاب'' (۲/۹) اور خرچ کرو، پس تحقیق بہتر زادِ تقویٰ ہے اور ڈرو مجھ سے اے عقل والو۔ اس آیت میں بھی خطاب عقل والوں سے کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ تقاضائے عقل کیا ہے؟ یہی کہ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ممکن ضرر سے بچیں اور ممکن فائدہ اٹھائیں۔ لیکن جہاں امکان ایک شے کا ہے، وہاں امکان اس کی مخالف شے کا بھی ہے۔ جہاں امکان ایک شے کے ہونے کا ہے، نہ ہونے کا بھی ہے۔ اس لیے ہماری تمام تر کوشش اس بات پر صرف ہونی چاہیے کہ جس کا امکان ہے اور وہ مفید ہے تو وہ ہو اور جس کا امکان ضرر ہے وہ نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ توکل علی اللہ ہونا چاہیے۔ اس لیے:

گفت پیغمبر با آواز بلند　　بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

اعرابی نے اگر اونٹ کو کھلا چھوڑ رکھا ہے تو زیادہ تر امکان اس بات کا ہے کہ اونٹ آوارہ ہو کر گم ہو جائے اور اگر اس کا زانو باندھ دیا ہے تو زیادہ تر امکان اس امر کا ہے کہ وہ کہیں نہیں جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشادِ الٰہی ہوا کہ ''شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ، ان اللہ یحب المتوکلین'' (۴/۸) ''اصحاب سے امر میں مشورہ کیا کر، پھر جب مشورہ کے بعد کسی امر کے کرنے کا عزم کرلیا

تو اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے کر گزر۔ تحقیق اللہ توکل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔"

"وان لیس للانسان الّا ما سعیٰ، وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزایۃ الجزا الا دفٰی وان الی ربک المنتھٰی" (۷/۲۷) انسان کو کچھ نہیں مل سکتا مگر وہ جس کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش کا نتیجہ جلد ہی دیکھا جائے گا اور پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ تمام امور کا مرجع اور انتہا تیرا پروردگار ہی ہے۔

اس لیے توکل کا یہ مفہوم ہے کہ پہلے انسان کو اسباب کا علم ہونا چاہیے۔ پھر ان اسباب کو ایسے عمل میں لانا چاہیے جس کے لیے وہ فطرتاً وضع ہوئے ہیں۔ یہ عین منشاء فطرت کے مطابق ہے اور یہ جو امام صاحب نے لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص زادِ سفر نہ لے اور توکل پر چل کھڑا ہو، اس امید پر کہ کوئی اللہ کا بندہ مل جائے گا جو خور و نوش کا سامان کر دے گا، تو کم از کم میں اس میں ذلت نفس محسوس کرتا ہوں۔

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است رفتن بپاء مردی ہمسایہ در بہشت

اگر وہ طالب حق ہے تو سفر و حضر میں اسے اپنے پاس کافی ذخیرہ ضروری اشیاء کا رکھنا چاہیے۔ اس خیال سے کہ کسی اور ضرورت مند کی حاجت روائی بھی ہو سکے اور جو اس کی اپنی ضرورت سے زائد ہو گا وہ تو اہل حاجت پر صرف ہی کرے گا جو کچھ اس کی اپنی ضرورت کے لیے کافی ہے اس میں سے بھی ان پر صرف کرنا چاہیے جن کی ضرورت اس کی اپنی ضرورت سے بڑھ کر ہے اور فوری تسکین کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ تمام بحث کے بعد اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسباب سے دور رہنا اور اسباب کے نتائج کی توقع رکھنا حکمت الٰہی کے مخالف ہے اور سنت اللہ سے بھی ناواقفیت ہے اور اللہ کے دستور کے مطابق عمل کرنا اس طرح کہ توکل خدا پر ہو نہ کہ اسباب پر، صحیح توکل ہے۔

اسباب پر توکل اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ اسباب مخلوق ہیں اور اللہ خالق اسباب ہے۔ اگر اسباب پر توکل ہو گا تو مخلوق پر ہو گا اور یہ شرک ہے۔ اسی باطل توکل سے شخصیت پرستی رائج ہوتی اور انسان کی قوتِ فکر یہ مقید ہو کر رہ گئی۔

رزق ہر چند بے گماں برسد شرط عقل است جستن از درہا
بے اجل گرچہ کس نمی میرد تو مرد در دہانِ اژدرہا (سعدی)

Marfat.com

ایک حدیث ہے کہ ''اگر اللہ پر کما حقہ توکل کیا جائے تو رزق اس طرح ہے جس طرح پرندوں کو، کہ صبح بھوکا اٹھتا ہے اور شام کو شکم سیر ہوتا ہے۔'' لیکن لوگ اتنا خیال نہیں کرتے کہ جانور صبح اٹھتے ہیں تو تلاشِ رزق میں نکل جاتے ہیں اور رزق پا لیتے ہیں۔ رزق عموماً ذخیرہ نہیں کرتے کیونکہ ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ ان کو روزانہ رزق سعی سے مل جاتا ہے۔ سعی کی نفی تو اس حدیث میں بھی نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اسباب پر توکل نہ کرنا چاہیے۔ خالق اسباب پر توکل کرنا چاہیے اور اگر بغور دیکھا جائے تو ''خواہشات'' جو تلاش رزق کی محرک ہیں، ہماری پیدا کردہ نہیں۔ کون بے وقوف بھوکا پیاسا رہنا پسند کرے گا۔ جس کی شدت ہلاکت تک پہنچا دیتی۔ جب نہ اسباب، جن سے ہماری خواہشات کی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہماری خواہشات ہی ہماری پیدا کردہ ہیں تو مناسب یہی ہے کہ ہم سمجھیں کہ اسباب خارجی جو ہماری خواہشات کی تسکین کا موجب ہیں، ہماری بقائے حیات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اقوالِ ائمہ صوفیہ اور واقعات جتنے بھی بیان فرمائے ہیں وہ صرف ان اسباب کے متعلق ہیں جو خور ونوش کے بارہ میں ہیں اور مادی ہیں۔ حضرت سہیل شتریؒ سے کسی نے پوچھا کہ ادنیٰ مرتبہ توکل کیا ہے؟ فرمایا آرزوؤں کا ترک کرنا۔ سائل نے پوچھا اوسط کیا ہے؟ فرمایا، اختیار کا ترک کرنا۔ سائل نے اعلیٰ درجہ دریافت کیا تو کہا کہ متوکل اپنی حرکات وسکنات میں ایسا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جیسے مردہ بدست زندہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ جو شخص توکل ورضا وتسلیم وتفویض کے اس مقام پر پہنچ جائے، وہ صوفی ہے۔ لیکن دُنیا میں صرف شکم پروری ہی ایک کام نہیں، یہ تو بہائم بھی توکل ہی پر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا توکل اس امر میں انسان سے بڑھا ہوا ہے۔ اصل توکل وہ رزق ہے جو انسان کے شایان ہے کہ ''الغیب'' پر کامل ایمان ہو۔ ''الغیب'' وہ امکانات ہیں جو ذرّہ ذرّہ میں پوشیدہ ہیں اور لا انتہا ہیں، اور ''تذکر وتفکر'' سے ان کی جستجو میں لگا رہے جو اس کی ''سعی'' ہے اور یقین کرے کہ اس پر ایک نہ ایک دن منکشف ہوگا۔ اہل علم وحکمت اپنی عمر اسی کے لیے وقت کر دیتے ہیں اور جب ''الغیب'' کا کچھ حصہ ان پر منکشف ہوتا ہے تو خلق خدا پر ظاہر کرتے ہیں یعنی ان کی زندگی خلق خدا کی بہبودی اور بہتری اور ان کی خدمت میں صرف ہوتی ہے۔ توکل کی مزید تشریح امید وبیم یا رجا وخوف کے تحت کی جائے گی۔

Marfat.com

خوف ورجا

امید وبیم دو کیفیتیں ذہنی ہیں اور دونوں ''اعمال'' کی محرک ہیں اور دونوں پر علم مقدم ہے۔ مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ ''گندم از گندم بروید، جو ز جو'' اور یہ بھی جانتا ہے کہ کانٹے بو کر پھول کی امید عبث ہے۔

بر آنکہ تخم بدی کشت وچشم نیکی داشت دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

ضرور ہے کہ ایسا شخص قابل قطعہ اراضی میں قابل ثمر بیج بوتا ہے اور ہر ایک ممکن کوشش کرتا ہے کہ اسے آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے اور جو امور اس کے احاطہ احتیاط سے باہر ہیں ''توکل'' سے کام لیتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ژالہ باری اور مضر جراثیم سے محفوظ رکھے گا۔ جن امور پر اس کو اختیار ہے، ان پر اسے پختہ یقین اور کامل امید اس نتیجہ کی ہوتی ہے کہ اس کی محنت بار آور ہوگی۔ اور جن پر اختیار نہیں ہوتا وہ اللہ پر بھروسا کرتا ہے اور اگر اس توکل پر اسے خیر کی توقع نہ ہو تو وہ کسی امید کے ساتھ عمل نہیں کرے گا۔ غرض ''رجا'' یا امید میں اعمال کی ترغیب وتحریص ہوتی ہے اور ''خوف'' میں ''ترہیب'' مثلاً کوئی صاحب امر کسی کو جو اس کا زیر دست ہے کسی امر کے کرنے اور کسی امر کی نہی کرے۔ ''خوف'' میں اسے صاحب امر کے اختیارات کا علم ہوتا ہے مگر عمل کے نتائج کا علم نہیں ہوتا مگر اس اجر کی امید ہوتی ہے جو اس کو صاحب امر اس کے احکام کی تعمیل کے صلہ میں دیتا ہے، اور بندہ پروری کرتا ہے۔

ارشادِ قرآن ہے کہ

''ان الذین اٰمنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولٰئک یرجون رحمتہ اللہ'' (۲/۱۱) جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت لوجہ اللہ کی، اور فی سبیل اللہ انتہائی کوشش ممکنہ کی، وہی ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

اس آیات سے واضح ہوتا ہے کہ علم اعمال پر مقدم ہے۔ ایمان کیا ہے؟ پختہ یقین جو متزلزل نہ ہو اور مومنین کو پختہ یقین اللہ کی رحمت پر پہلے ہی ہوتا ہے اور جو کچھ تقاضا رحمت ومغفرت ہے اس کے مناسب ان سے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی عمل کو کرنے سے پیشتر اس عمل کے نتائج کا علم یقینی ہونا لازم ہے، ورنہ یہ عمل عبث ہوگا اور

Marfat.com

''رجا'' کا مفہوم اس آیۃ کریمہ میں یہ ہے کہ ایسا علم محض اللہ تعالیٰ کی رحمت بالغہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

ارشادِ قرآن ہے کہ

''ان الذین یتلون کتاب اللہ و اقام الصلوٰۃ و انفقو مما رزقنٰھم سراً وعلانیہ یرجعون تجارۃ لن بتوراً ''(۳/۶)

وہ لوگ جو اللہ کی کتاب (کائنات اور قرآن جو بیان و تفصیل کتاب اللہ ہے) پڑھتے ہیں اور (اس کے مطالب سے آگاہ ہیں) صلوٰۃ (تعلق باخدا) اور جو کچھ ان کو اللہ نے دے رکھا ہے (علم و مال و منال) صَرف کرتے ہیں، ان کے مفاد کے لیے جو اس سے محروم ہیں، خفیہ اور اعلانیہ وہ ایسی تجارت کے نفع کے امیدوار ہیں جو غیر ممنون ہے، کبھی منقطع نہ ہوگا۔

اگر ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا جائے تو ہمیں اپنے ایمان و عمل کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ''کل یعمل علیٰ شاکلتہٖ'' (۱۵/۹) کائنات میں ہر ایک شے سے وہی عمل صادر ہوتا ہے اور اسی عمل کا صدور اس سے ممکن ہے جو اس کی فطری ڈیل ڈول کے مناسب ہے اور ہر ایک شے بہ تقاضائے فطرت و استعداد سرگرم عمل ہے اور اسی میں اس کی زندگی ہے اور اسی میں وہ راحت محسوس کرتی ہے۔ ایک ننھی سی جان چیونٹی کو دیکھو، وہ وہیں پہنچے گی جہاں اس کی فطرت اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کو دیکھو، وہ ہمیشہ پھولوں اور پھلوں پر منڈلاتی نظر آئے گی۔ اگر انسان بھی اسی طرح بہ تقاضائے فطرت کرتا (Instinctively) تو اس کا امکان ہے، لیکن وہ پھر انسان نہ ہوتا۔ دیگر حیوانات کی طرح ایک نوع حیوانی ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات باتباع فطرت غلطی نہیں کرتے مگر ان میں ارتقا بھی نہیں ہے۔ انسان اکثر غلطی کرتا ہے اور اس کا غلطی کرنا واجب ہے، اس لیے ترقی کر رہا ہے۔ انسان میں مابہ الامتیاز ایک ہی شے ہے، جسے ''قوت فکریہ'' کہتے ہیں۔

اے برادر تو ہمیں اندیشہ ... مابقی تو استخوان دریشہ

اس لیے انسان کو اگر دیگر اشیاء میں فضیلت حاصل ہے تو اسی ''علم'' اور ''بیان''

کی وجہ سے، یعنی اظہار علم کے باعث ''**خلق الانسان علمه البیان**'' (۲۷/۱۱) یہ بیان کیا ہے؟ کتاب کائنات کے معانی یا حقائق کا علم، جس کو وہ عملاً واضح کرتا ہے۔ اگر یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے تو مسائل ''جبر و اختیار'' پر جو بحثیں کی گئی ہیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی اور ''توکل'' اور ''خوف و رجا'' کی حقیقت بھی خود بخود منکشف ہو جائے گی۔ طبقہ نباتات پر نظر کرو، اس کی جڑیں زمین سے وہی خوراک فطرتاً حاصل کریں گی جو ان کی زندگی اور زندگی کے قیام کے لیے ضروریات سے ہے۔ کسی آتش کدہ میں نباتات کا وجود محال ہے۔ اسی طرح حیوانات فطرتاً (By Instinct) وہ خوراک کبھی قبول نہ کریں گے جو ان کی صحت کے لیے مضر ہے اور وہ اپنے دشمنِ زندگی سے بھی خوب واقف ہیں اور اپنی خیر اسی میں جانتے ہیں کہ ان سے دُور رہیں۔ اگر شیر کی آواز سن لیں، بلکہ دُور سے اس کی بو سونگھیں، گھوڑا اور گائے اور وہ تمام حیوان جو شیر کی خوراک ہیں، راہ فرار اختیار کریں گے خواہ انہوں نے پہلی دفعہ شیر کی آواز سنی ہو اور ان کے آبا و اجداد نے کبھی نہ سنی ہو۔ اسی طرح انسان بھی ''**علی نفسه بصیرہ**'' ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ ''تقویٰ'' اختیار کرے۔ یعنی مضر تاثرات سے بچے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کو عملاً اس کا شعور ہونا چاہیے ورنہ وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ ''تصوف'' میں انہی فطری قوتوں کو عمل میں عملاً لانا مقصود ہے جو بعض اسباب کے زیرِ اثر دبی ہوئی ہیں۔

یہ حقیقت بھی اچھی طرح دل نشین کرنی چاہیے کہ شریعت اور طریقت میں توکل اور خوف و رجا اور صبر اور رضا وغیرہ لازم و ملزوم ہیں لیکن معرفت میں عمل خود بخود اسی طرح صادر ہوتا ہے جس طرح دیگر اشیاء سے اس کا علم و شعور باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن ''حقیقت'' میں یہ بھی نہیں رہتا۔ یہ ایک حالت اطمینانِ قلب ہے اور تصوف کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ انسان اس مقام تک پہنچ جائے۔ اقوال ائمہ تصوف میں توکل و تسلیم و تفویض میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی کچھ ہے۔ ترک اسباب اور ترک اختیار اور ترک علم و شعور بظاہر ایسی اصطلاحیں ہیں جنہیں سن کر اہل عقل چونک پڑتے ہیں اور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تصوف بے کاری و ناداری و افسردگی سکھاتا ہے۔ لیکن اس تشریح کے بعد امید ہے کہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ اہل تصوف ہی اہل علم و عمل ہیں۔ دونوں کی حقیقت ان پر واضح ہوتی ہے۔ اگر معترضین ذرا انصاف سے کام لیں تو ان پر واضح ہو

Marfat.com

جائے گا کہ اوّل تو ان سے کوئی ایسا عمل صادر نہیں ہوتا جو فطرتاً پسندیدہ ہو۔ اور اگر ہوتا ہے تو بہ تکلف اور بادل نخواستہ۔ وہ زیادہ تر ریاکار ہیں کہ لوگوں سے اپنی بداعمالی پوشیدہ رکھنے کے لیے انتہائی کوشش کرتے ہیں اور کنج خلوت میں معصیت پر دلیر ہوتے ہیں۔ اہل معرفت جن کو یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات خواہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہو چھپی نہیں رہ سکتی اور خود ہمارے نفس (EGO) سے بھی پوشیدہ نہیں تو وہ اپنے باطن کے تزکیہ میں انتہائی سعی کرتے ہیں۔

آنکہ در نفس خود زبوں باشد　　عارف کردگار چوں باشد
(حدیقہ سنائی)

اور واعظان شہر جو ناز و کرشمہ بر سر منبر کرتے ہیں، ان کا حال کس سے پوشیدہ ہے!

واعظاں کہ جلوہ محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانش مند شہر ایں باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند
(حافظؒ)

ارشادِ قرآن ہے کہ:

"اتأمرون الناس بالبر و تنسون انفسکم" (۵/۱) یہ جو اہل تصوف کو گمراہ کہتے ہیں ان کے اعمال ناشائستہ کا مقابلہ اہل دل صوفیان باصفا سے کیا جائے۔ سید حبیب اللہ المعروف بلھے شاہ قصوری پنجابی میں کہتے ہیں کہ:

"بلھیا تینوں کافر کافر آکھدے، توں آہو آہو آکھ"

اے حبیب! تجھے کافر کافر کہتے ہیں، تو کہہ 'سچ کہتے ہو!'

روایت ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دل کھول کر مذمت تکذیب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچ کہتا ہے۔ صدیق اکبرؓ نے مدح اور تصدیق کی، تو فرمایا سچ کہتا ہے۔ کسی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کیسے سچے ہو سکتے ہیں۔ فرمایا، میں آئینہ ہوں دونوں اپنی ہی صورت زشت و خوب دیکھتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مقام علم و یقین صوفیہ کرامؒ ہی کو حاصل ہوتا ہے جو ان کا "حال" ہے۔ یہ شیخان جاہل اور پیران گمراہ نری باتیں ہی بنانا جانتے ہیں۔ حیرت ہے کہ انہی باتوں کے گرویدہ عوام کالانعام ہیں جو عقل

Marfat.com

کے اندھے اور گانٹھ کے پورے ہوتے ہیں۔ یہ واعظانِ بے عمل اور پیرانِ چغل باتیں تو اہل اللہ کی سی کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　پس نباید داد در ہر دست دست

اکثر اشخاص آدم صورت شیطان سیرت ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت بلا تحقیق نہ کرنی چاہیے۔

زآں کہ صیاد آورد بانگ صفیر　　　تا فریبد مرغ را آں مرغ گیر

ان لوگوں کی مثال ایسے شکاری کی ہے کہ جو منطق الطیر سے واقف تو ہے اور پرندوں کی بولیاں بولتا ہے، تاکہ پرندے اس کے دام فریب میں آئیں۔

بشنود آں مرغ بانگ جنس خویش　　　از ہوا آید، بیابد دام و نیش

پرندہ اپنے ہم جنس کی آواز پر اڑتے ہوئے اس کی طرف آتا ہے اور آتے ہی جال میں پھنس کر شکاری کا شکار ہو جاتا ہے۔

حرف درویشاں بدزدد مردوں　　　تا بخواند بر سلیمے زاں فسوں

اسی طرح کمینے لوگ اہل اللہ کی باتیں چرا کر بیان کرتے ہیں۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ سادہ لوح لوگوں پر ان کا جادو چل جائے۔

کار مرداں روشنی و گرمی است　　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی است

مردانِ خدا کا کام تو لوگوں کو ظلمت جہل سے نورِ علم میں لانا ہے اور کمینے لوگوں کا کام مکر و فریب اور بے حیائی ہے۔

شیر پشمیں از برائے گد کنند　　　بو مسیلم را لقب احمد کنند

منگتے لوگ اون سے شیر تو بنا لیتے ہیں، بو مسیلم کا لقب احمد قرار دیتے ہیں۔

بو مسیلم را لقب کذاب ماند　　　مر محمد را الوالالباب ماند

بو مسیلم تو کذاب کے لقب ہی سے مشہور ہوا لیکن آں حضرتؐ الوالالباب قائم و

Marfat.com

دائم ہیں۔

آں شراب حق ختامش مشک ناب باده را ختمش بود گند و عذاب

محمدؐ کا کلام وہ شرابِ حق ہے جس پر مہر مشک کی ہے، مسیلمہ کذاب کی باتیں وہ خمر ہے جو بدبو اور عذابِ جان ہے۔

اگرچہ ان باتوں کا تذکرہ خود تکلیف دہ ہے لیکن میں اس لیے بیان کرتا ہے کہ طالبانِ حق ان لوگوں کے فریب سے بچیں۔

''کہ وعظ بے عملاں واجب است نشنیدن''

جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ہر ایک شخص ''از مقام و حال خود گوید خبر'' اور یہ کہ ذہنی درجات ایک کے دوسرے سے بلند تر ہیں۔

''وتلک حجتنا اٰتینٰھا ابراھیم علٰی قومہٖ ط نرفع درجٰتٍ من نّشآء ان ربک حکیم علیم'' (۷/۱۶)

یہ دلائل تھے (اجرام سماوی سورج وغیرہ کا مخلوق اور قوانین الٰہیہ کا پابند ہونا) جو ہم نے ابراہیم کو سمجھا دیئے، جس کا جواب اس کی مشرک قوم سے بن نہ آیا اور اس طرح ہم جس کے چاہتے ہیں ذہنی درجات بلند کرتے ہیں اور یہ عین تیرے پروردگار کے علم اور حکمت کے مطابق ہے۔

تمام قوم ایک طرف اور حضرت ابراہیمؑ ایک طرف۔ جو حقیقت آپ پر منکشف ہوئی وہ قوم پر نہ ہوئی اور انکشاف کے بعد بھی قوم نے انکار کیا۔ جس مقام پر حضرت ابراہیمؑ تھے وہ تمام قوم کی رسائی ذہن سے بالاتر تھا۔ اسی طرح صوفیہ کرام جو بات کہتے ہیں وہ انہی کے حال اور مقام کے مناسب ہے۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس دلبرا خطا ایں جاست
(حافظؒ)

شہنشاہ غازی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایک بزرگ نے عربی میں ایک رسالہ بنام ''تسویہ'' لکھا۔ اس میں لکھ دیا کہ ''جبرئیل انبیاء کی ایک قوت ادراکیہ ہے۔'' وہ تو

تاریخی واقعات یہ ہیں کہ ہمارے ہندوستان میں تاریخی زمانہ سے آج تک ملوکیت قائم رہی اور اس ملک میں کبھی روح جمہوریت کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ اس لیے انسانوں کو ذاتوں میں تقسیم کیا گیا۔ برہمن اور چھتری جو راجے اور مہاراجے اور سپاہی اور وزراء تھے، بلند مرتبہ تصور کیے گئے اور یہ علو مرتبہ ان کا پیدائشی حق تھا۔ نیچ ذات ''دلیش'' تھے۔ جو کھیتی باڑی، صنعت و حرفت اور تجارت میں مشغول رہتے۔ اس لیے یہ سب پیشے ذلیل سمجھے گئے اور یہی حالات ایران میں بھی تھے۔

خلافت راشدہ کے بعد ہاشمی اور اُموی خاندانی رقابت نے دنیائے اسلام میں ملوکیت قائم کر دی اور لوگوں کی آزادئ فکر و عمل سلب ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ملوک ایسے ہی ''ظل اللہ'' بن گئے جیسے ہندوستان کے راجے ''نہ کلنک'' تھے اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ انہی کی بندگی میں رزق بھی ملتا ہے اور ہم چشموں میں عزت و احترام بھی ہے۔ شعرا مدحیہ قصائد کہتے اور عوام ان کے محلوں کا طواف کرتے نظر آتے۔

یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ جسے آزادی کہتے ہیں اور جو ایک فطری جذبہ ہے، مخلوق اسی صورت میں اس سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں کہ خالق کی عبادت بلا شائبۂ شرک کریں۔ جو شخص بندوں کا بندہ ہے، وہ بقول حکیم سنائی

آنکہ در نفس خود زبوں باشد عارف کردگار چوں باشد

یہی وجہ ہے شیخانِ طریقت مریدانِ با اخلاص کو پہلا سبق یہ پڑھاتے کہ توکل و قناعت کو اپنا پیشہ بناؤ اور کبھی کسی شخص کے سامنے دست سوال دراز نہ کرو، بالخصوص سلاطین اور امراء وزرا سے دور تر رہو۔ محنت و مشقت جو بھی ملے اسی پر قناعت کرو اور صبر و شکر کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ ''اگر سائل کو معلوم ہو کہ سوال میں کتنی ذلت نفس ہے تو بھوکا رہنا پسند کرے گا اور تا قیامت سوال نہیں کرے گا۔

سلاطین و امراء وزراء کی زندگی مسرفانہ ہوتی ہے، جس سے بندگانِ خدا کے حقوقِ شہریت تلف ہوتے ہیں۔ اہل تصوف جیسا کہ تذکروں میں مذکور ہے خود بھوکے رہتے اور دوسروں کی ضرورت مقدم سمجھ کر ان کو دیتے۔

چونکہ دُنیوی نعمتوں میں ایک کشش ہے اور انسان حظِ نفس کا طالب ہے، اس لیے شیخانِ کامل مریدوں کے دل پر دُنیا اور دُنیا کی بے ثباتی نقش کرتے کہ یہی اشیاء ہیں

جن کی طلب میں یا احساسِ احتیاج کے ساتھ شیر بھی روباہ مزاج بن جاتے ہیں۔ جب ایک دفعہ طالبِ حق کی توجہ دنیا اور دنیا داروں سے ہٹ گئی تو وہ فطرتاً بے طلب نہیں رہ سکتا۔ وہ طالب حق ہو جاتا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ تیمور نے ایک اہل دل کو دیکھا کہ اپنے کپڑے آپ دھو رہا ہے۔ کہا کہ ''آپ بڑے متوکل ہیں۔'' جواب دیا کہ ''نہیں آپ بڑے متوکل اور قانع ہیں، اس لیے دنیا چند روزہ گذشتنی اور گذاشتنی ہے اور اس کی نعمتیں بھی اور دُنیوی زندگی بھی آنی جانی ہے۔ ہم نے پہلے ہی اسے ترک کر دیا تو کون سا بڑا کام کیا۔ آپ ہیں کہ آخرت کو جو دائمی ہے چھوڑ کر تھوڑے پر جو دنیا ہے قناعت کیے بیٹھے ہیں۔''

اس میں کچھ شک نہیں، حریت و مساوات و اخوت کے جذبات ان ایام میں اگر کہیں تھے تو اہل تصوف کے دلوں میں تھے اور اب بھی اگر لوگ چاہیں کہ اسی آزادی سے ہم کنار ہوں تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ توکل و تسلیم و رضا و صبر و شکر کو اپنا خلق بنائیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہوئے ہم نوا ہوں کہ ''**الفقر فخری**''۔

ان تاریخی واقعات کے بیان سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ان ایام کی خصوصیت بھی سامنے آ جائے جن کا تقاضا تھا کہ اہل تصوف اوّل تو زیادہ تر گوشہ نشیں رہیں اور امیروں سے بالکل میل جول نہ رکھیں اور اگر فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جائے تو برداشت کریں۔ جب یہی باتیں عادتاً کی گئیں اور ایک آدھ صدی اسی عادت یا اخلاق پر گزر گئی تو خود صوفیوں کا بھی یہی عقیدہ پختہ ہو گیا کہ صوفی وہی ہے جو فقر و فاقہ میں زندگی بسر کر دے اور لوگوں کو بھی ان سے یہی توقع تھی۔ اس لیے کسی صوفی کو دیکھتے کہ اس کا ظاہر حال بھی آراستہ تھا اور کھانے پینے میں بھی کچھ سلف کے خلاف ہی ہے تو اسے دنیا دار ہی سمجھتے۔ نفس انسانی ہمیشہ افراط و تفریط کی طرف مائل رہتا ہے۔ ''تعدیل'' دراصل سخت مجاہدہ ہے اور اس پر اہل علم و حکمت ہی قائم رہ سکتے ہیں۔ اس لیے مجاہدہ میں غلو، اور وہ بھی اتنا کہ رُہبانیت کی حد تک پہنچ جائے، اسلامی تصوف نہیں اور مسرفانہ زندگی تو بہرحال ممنوع ہے۔ تصوف یہی ہے کہ اہل دل کوئی امتیازی نشان اپنے لیے پیدا نہ کرے اور لوگوں میں اُسی طرح رہے جس طرح لوگ رہائش رکھتے ہیں اور کسی کو معلوم بھی نہ ہو کہ حضرت کسی اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ اصل اصول اخلاق تعدیل ہے۔ ''تعدیل بہر امر کمال عرفانست''۔

Marfat.com

ہی صفت ہے اور پھر یہی کچھ عام لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔اس لیے فرمایا کہ:

''لقد کان لکم فی رسول الله اسوۃٌ حسنه، لمن کان یرجو الله والیوم الاخر و ذکر الله کثیراً '' (۲۱/۱۹) البتہ تحقیق تم میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نیک نمونہ ہے۔اس شخص کے لیے جو اللہ سے ملاقات کی لو لگائے اور یوم آخرت اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

سعد بن ہشام سے روایت ہے کہ ''میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں گیا اور پوچھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے۔فرمایا کہ ''تو قرآن پڑھتا ہے؟'' میں نے کہا، ''ہاں'' تو فرمایا کہ ''تمام قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق ہے۔'' جو شخص قرآن جیسی عظیم الشان کتاب لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کو خود عملی نمونہ اس کا ہونا چاہیے۔ اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

''فقد بشت فیکم عمراً مّن قبلهٖ افلا تعقلون، فمن اظلم ممن افتریٰ علی الله کذباً او کذب بایٰتهٖ ط انه لا یفلح المجرمون '' (۷/۱۱) تحقیق میں تم میں اس سے پیشتر ایک عمر بسر کر چکا ہوں۔تم عقل سے کام نہیں لیتے (کہ میں نے اپنے ذاتی فائدہ کے لیے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور تم جانتے ہو تو کیا اب اللہ کے نام پر جھوٹ بولوں گا) اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ تحقیق مجرم کبھی چھٹکارا نہ پائیں گے۔

ہم نے اس کتاب میں مناسب مقام پر ''طریقت'' پر بھی بحث کی ہے۔ ہر ایک شیخ طریقت طالب حق کی اسی طرح تادیب اور تہذیب نفس کرتا ہے جب اس کی عادات سدھر جاتی ہیں اور اس کے اعمال پسندیدہ ہوتے ہیں تو پھر طالب اس لائق ہوتا ہے کہ جادۂ سلوک میں قدم آگے بڑھائے۔ اس لیے یہ اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے جسے شیخ سعدی چند لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''محال است سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت خبر در پے مصطفٰے''

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے کہ ''**اللهم احسنت خلقی فاحسن خلقی**'' ''الٰہی تو نے میرا ظاہر پیدائشی اچھا بنایا تو میرا باطن بھی اچھا بنا،'' اور یہ بھی دعا

Marfat.com

فرمایا کرتے کہ ''اللھم اجبتنی سکرات الاخلاق '' ''الٰہی مجھے بری عادات سے علیحدہ رکھ'' اور ارشاد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''میں اس لیے مبعوث ہوا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔''

علم اخلاق ایک مستقل موضوع ہے۔ اس پر حکماء نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ اخلاقِ حسنہ کا اصل اصول ''عدل'' ہے۔ یعنی افرط وتفریط سے بچ کر معتدل راستہ اختیار کرنا۔ اس لیے امت مسلمہ کو امت وسطیٰ کہا گیا ہے۔

''تعدیل بہر امر کمال عرفاست''

علامہ محمود گلشن راز میں لکھتے ہیں کہ:

ہمہ اخلاق نیکو درمیان ست — کہ از افراط وتفریطش کران ست

تمام اخلاق حسنہ وسط میں ہیں اور وسط افراط وتفریط سے جو کنارہ پر ہیں، دور ہے۔

میانہ چوں صراط المستقیم است — ز ہر دو جانبش قعر جحیم است

صراط مستقیم حد وسط ہے اور اس کے دو جانب یعنی افراط وتفریط دوزخ ہے۔

چناں، کز ظلم شد دوزخ مہیا — بہشت آمد ہمیشہ عدل راجا

جس طرح ظلم سے دوزخ کے اسباب مہیا ہوتے ہیں، اسی طرح بہشت دائمی عدل کا مقام ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''قیامت کے دن سب سے بھاری شے (تمہارے نیک اعمال سے) تقویٰ اور حسن خلق ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا کہ ''ما الدین'' دین کیا ہے۔ فرمایا کہ ''حسن الخلق''۔ اور کسی نے پوچھا کہ ''نحوست کیا ہے۔'' فرمایا، ''بدخلقی'' کے ذیل میں ائمہ تصوف کے اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) جو کوئی بدخلقی کرتا ہے اپنی جان کو ستاتا ہے۔ (حسن بصریؒ)

(۲) حسن خلق روزی کا خزانہ ہے۔ (یحییٰ بن معاذؒ)

(۳) بدخلق آدمی پھوٹے گھڑے کی مانند ہے نہ جڑ سکے اور نہ مٹی ہو۔ (وہب بن منبہؒ)

(۴) خوش خلق بدکار کی صحبت میرے لیے بدخلق عابد سے بہتر ہے۔ (فضل بن عباسؒ)

Marfat.com

(۵) چار باتیں آدمی میں ایسی ہیں کہ گو علم و عمل کم ہو پھر بھی اعلیٰ درجات مل جاتے ہیں۔ وہ حلم اور تواضع اور سخاوت اور حسن خلق ہیں۔ (جنید بغدادیؒ)

(۶) تصوف خلق کا دوسرا نام ہے۔ (کنانیؒ)

(۷) لوگوں سے اخلاق کے ساتھ ملو اور اعمال کی جہت سے ان سے علیحدہ رہو۔ (حضرت عمرؓ)

(۸) بدخلقی ایسی بلا ہے کہ اس کے ہوتے کثرت حسنات بے فائدہ ہیں اور خوش خلقی ایسی خوبی ہے کہ اس کے ہوتے سیئات کی کثرت سے ضرر نہیں۔'' (یحییٰ بن معاذؒ)

(۹) شرف رتبہ صرف حسن خلق سے حاصل ہوتا ہے۔ (ابن عطاؒ)

(۱۰) خوش خلقی کا مفہوم یہ ہے کہ کشادہ پیشانی رہے۔ دولت کو جمع نہ کرے نیک کاموں پر صرف کرے اور ایذا سے باز رہے۔ (حسن بصریؒ)

(۱۱) خوش خلقی یہ ہے کہ نہ خود کسی سے خصومت کرے اور نہ اس سے کوئی خصومت کرے اور مفلسی اور تونگری میں راضی رہے۔ (واسطیؒ)

(۱۲) خوش خلقی یہ ہے کہ ایذا سے باز رہے اور مشقت برداشت کرے۔ (شاہ کرمانیؒ)

(۱۳) ادنیٰ درجہ خوش خلقی کا یہ ہے کہ صبر کرے اور انتقام نہ لے۔ بلکہ ظالم پر رحم اور شفقت کرے اور اس کے لیے مغفرت چاہے۔ (سہیل تستریؒ)

(۱۴) خوش خلقی سے مراد حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ (ابو عثمانؒ)

(۱۵) رزق کے بارہ میں خدا سے بدگمان نہ ہو۔ اس پر توکل کر۔ (سہیل تستریؒ)

(۱۶) خوش خلقی تین چیزوں میں ہے۔ محرمات سے بچنا (تقویٰ)، حلال روزی کی تلاش اور عیال پر زیادہ خرچ کرنا۔ (حضرت علیؓ)

(۱۷) خوش خلقی یہ ہے کہ اظہار حق کے بعد لوگوں کے ظلم سے متاثر نہ ہو۔ (حسین بن منصورؒ)

(۱۸) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور طرف ہمت نہ کرنا خوش خلقی ہے۔ (ابو سعید خرازؒ)

مذکورہ بالا اقوال اخلاقِ حسنہ کے ثمرات ہیں۔ یعنی جب نفس انسانی تہذیب خلق سے آراستہ ہو جاتا ہے تو یہ باتیں خود بخود اس میں پیدا ہو جاتی ہیں اور درخت ثمر ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اخلاق کی اصل چار چیزیں ہیں۔ عدل اور

حکمت اور شجاعت اور عفت۔ اس موضوع پر اخلاق کی کتابوں میں مفصل بحث کی گئی ہے۔اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

شیخ سعدیؒ نے بایزید بسطامیؒ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ عید کے دن حمام سے غسل کے بعد نکلے تو کسی نے اپنے مکان سے راکھ کا ٹوکرا گلی میں پھینکا۔ آپ گزر رہے تھے آپ پر راکھ گری تو سجدہ شکر ادا کیا کہ یہ جسم تو دوزخ کی آگ کے لائق ہے، راکھ پر ہی خیر گزری۔

احنف بن قیسؒ کو ایک شخص نے گالیاں دینی شروع کیں۔ آپ ہنستے جا رہے تھے۔ جبکہ محلّہ کے قریب پہنچے تو ٹھہر گئے اور کہا کہ جی بھر کر جو کچھ کہنا ہو کہہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ محلّہ کا کوئی بے وقوف تیری آواز سن لے اور تجھے ایذا دے۔

ایک عورت نے مالک بن دینارؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''او ریاکار۔'' فرمایا کہ ''یہ نام تو نے خوب نکالا۔ آج تک اہل بصرہ بھولے ہوئے تھے۔''

یحییٰ بن زیاد حارثیؒ کے پاس ایک بدخلق غلام تھا۔ کسی نے کہا کہ آپ نے اسے کیوں رکھا ہے۔ فرمایا کہ حسن خلق اسی سے سیکھ رہا ہوں۔

شہنشاہ عالمگیر اپنے بیٹے کو لکھتا ہے (رقعات عالمگیری) کہ ''میں نے سنا ہے کہ تم فلاں پیر قطاع الطریق کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو اور اس کی باتوں پر فریفتہ ہو۔ برخوردار، یہ ریاکار، درویش نہیں۔ درویشوں کے اخلاق کچھ اور ہی ہیں۔ میں عبداللطیف قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ چاہتا ہوں کہ چند گاؤں آپ کی خانقاہ کے نام وقف کر دوں تا کہ خانقاہ، دریشوں اور طالب علموں کا خرچ نکل آئے۔ شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ:

''شاہ ما را دہ دہد منت نہد   رازق ما رزق بے منت دہد''

شاکر خان، میرزا عبدالقادر بیدل کا مرید با اخلاص تھا۔ شہنشاہ عالمگیر کی فوج میں اعلیٰ عہدہ پر ممتاز بھی تھا۔ کئی لڑائیوں میں نام پایا اور میوات وغیرہ کی مہمات میں نمایاں فتح حاصل کی۔ شہنشاہ کا بھی منظور نظر تھا۔ ایک دفعہ خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ شہنشاہ نے آپ کے نام دکن میں جاگیر منظور فرمائی اور فرمانِ جاگیر بھی پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں فقیر بے نوا ہوں۔ میرا کام تو اتنا ہی ہے کہ تمہارے جیسے مخلص

دوستوں کے حق میں دعائے خیر مانگوں اور یہ جاگیر تو میرے لیے اسبابِ پریشانی ہے۔

''فلک تکلیف جاہت گر دہد فال حماقت زن کہ غیر از گاؤ نتواند کشیدن بارِ دنیا را''

حضرت فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں وزیر ممالک ہند ملتان کی طرف جاتا ہوا اجودہن (پاک پتن) میں حاضر ہوا اور کچھ روپیہ نذر کیا اور چند گاؤں کی اراضیات بنام خانقاہ کا فرمان بھی پیش کیا۔ فرمان تو واپس کر دیا اور روپیہ اسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دیا۔

گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کا دستور تھا کہ کھانا خانقاہ کے درویشوں کے ساتھ مل کر کھاتے۔ درویش سب طالب علم ہی تھے۔ درس تدریس کے ساتھ مراتب سلوک بھی طے ہوتے۔ لنگر خانہ کا انتظام ان دنوں سید نظام الدین کے سپرد تھا جو بعد میں اولیا مشہور ہوئے۔

ایک دن دستر خوان چنا گیا تو باوا صاحب نے کہا کہ ''نظام الدین آج کھانے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اور کچھ نفرت سی محسوس کر رہا ہوں'' عرض کی کہ ''قبلہ ساگ پات تو وہی ہے جو روزانہ لایا کرتا ہوں مگر آج نمک نہ تھا۔ دُکان دار سے ادھار لایا ہوں۔'' فرمایا کہ ''آج کا کھانا پھینک دو۔'' اور کہا کہ ''آئندہ نمک نہ ہو تو بے نمک ہی سہی لیکن ادھار کبھی نہ لانا۔''

گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کا ہمشیرہ زادہ علاؤالدین جن کا مزار اب کلیر میں زیارت گاہ عام ہے، صابر کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کی والدہ باوا صاحب کی خدمت میں لائی اور کہا کہ ''بھائی یہ تمہارا بھانجا ہے، اس میں کیا قباحت ہے اگر تمہارے پاس رہے، کچھ علم بھی سیکھ جائے گا اور تمہارے لنگر خانہ سے اس کی پرورش بھی ہوتی رہے گی۔'' آپ نے لنگر خانہ کا انتظام نوجوان علاؤالدین کے سپرد کر دیا۔ چند ماہ بعد والدہ لڑکے کو ملنے آئی، دیکھا کہ بہت دبلا پتلا ہو رہا ہے۔ بھائی کے پاس شکایت کی تو آپ نے بھانجے سے دریافت کیا کہ ''میں نے تو لنگر خانہ ہی تمہارے سپرد کر دیا تھا۔'' عرض کی کہ ''آپ نے سپرد تو کیا مگر یہ تو نہ فرمایا تھا کہ وہاں سے جو ملے کھا لیا کرو۔'' پوچھا کہ ''اب تک کیا کرتے رہے۔'' عرض کی کہ ''گولر۔'' فرمایا، ''علی احمد تم تو بڑے 'صابر' ہو۔''

امرتسر میں مولوی عبد اللہ غزنوی ایک صاحب دل بزرگ گزرے ہیں۔

Marfat.com

مولوی غلام رسول قلعہ والے ضلع گوجرانوالہ، آپ کے دوست تھے اور اکثر صحبت گرم رہتی۔ غزنوی رحمتہ اللہ علیہ کے معتقد شہر میں بہت تھے۔ کسی تقریب پر جو عموماً شادی بیاہ وغیرہ کی ہوتیں، لوگ پلاؤ زردہ کی دیگیں بھیج دیا کرتے اور آپ طالب علموں میں تقسیم کر دیا کرتے۔ گھر میں عموماً فاقہ کشی ہی رہتی۔ ایک دن اہل بیت نے مولوی غلام رسول کو اس خیال سے کہ منظور نظر دوست ہیں، کہلا بھیجا کہ مولوی صاحب کو کہیں کہ اہل و عیال کا بھی کچھ خیال کبھی کبھی کیا کریں۔ مولوی صاحب نے موقع پا کر عرض کر دی، غزنوی رحمتہ اللہ علیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کہا کہ ''غلام رسول مولوی شدی، حاجی شدی، عالم شدی، صوفی شدی، مسلمان شدی۔''

ملا حسین کاشفی صاحب دل بھی تھے اور مصنف کتب کثیرہ بھی ہیں۔ ''رشحات'' میں خواجہ عبید اللہ احرار کا ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ خواجہ سلسلہ نقشبندی کے ائمہ میں سے ہیں۔ مولانا جامیؒ کے پیر و مرشد بھی ہیں۔ چنانچہ مولانا جامیؒ ''تحفۃ الاحرار'' میں لکھتے ہیں کہ:

چو فقر اندر لباس شاہی آمد   بہ تدبیر عبید اللہی آمد

والیٔ ہرات شاہ حسین، خواجہ صاحب کا مرید تھا۔ بابر نے ہرات اپنے قبضہ تصرف میں لانے کے لیے حملہ کر دیا۔ شاہ حسین قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتا رہا۔ ایک روز خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ مجھ میں بابر کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ آپ سے جدا ہونا بھی نہیں چاہتا۔ ابھی وقت ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو ہرات سے باہر نکل چلیں۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ مطمئن رہو، کل تم دیکھو گے کہ بے شمار کوے فضا میں اڑتے ہوئے آئیں گے۔ اس کے بعد آندھی سخت آئے گی۔ تم قلعہ سے نکل کر بابر کے لشکر پر حملہ کر دینا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے مریدان با اخلاص کو جمع کیا اور کہا کہ ''ہمت'' کرو کہ بابر کو شکست ہو۔'' سب خواجہ صاحب کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ دوسرے روز علی الصبح کوے بھی آئے اور آندھی بھی چلی۔ بابر کے لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی۔ خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ گھوڑے دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگنے شروع ہو گئے۔ عین اس وقت شاہ حسین نے حملہ کر دیا۔ بابر جان بچا کر بھاگا اور گھر پہنچ کر دم لیا۔ خواجہ صاحب کو کہلا بھیجا کہ مجھے شکست آپ نے اپنی ''ہمت'' سے دی۔ لیکن فقرا میں ''ہمت'' نہیں ہوتی۔ جواب دیا کہ ''ہمت'' ضرور نہیں ہوتی، لیکن ''غیرت'' ضرور ہوتی ہے۔ اور اگر تیرا باپ شیخ عمر میرا دوست نہ ہوتا اور مجھے اس کی رعایت نہ ہوتی تو اپنی بے ادبی کا

Marfat.com

انجام بھی دیکھ لیتا اور ہلاک ہو جاتا۔ خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں۔

روضۂ خلد بریں خلوت درویشانیست مایہ محتشمی دولت درویشانیست
گنج قاروں کہ فرد میرود از قہر ہنوز خوانده باشی کہ ہم از غیرت درویشانیست

اخلاقیات کی اصل محبت (Love) ہے اور یہ فطری رُجحان کسی نہ کسی مقصد کی طرف ہوتا ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند الفتش را درویش انداختند
(سعدیؒ)

اس لیے ضرور ہے کہ مقصد محبوب و مطلوب ہو۔ جسے ''حسن'' (Beauty) کہتے ہیں۔ محبّ اپنے مقصد میں مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی طرف اس کے دل کو ایک کشش ہوتی ہے اور وہ خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں ''شوق'' کہتے ہیں اور جب یہ شوق اس کو محبوب کے قریب لاتا ہے تو اس کے دل کو مشاہدہ جمال محبوب سے ایک سرور پیدا ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں ''انس'' کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ سے محبوب کی ''عظمت'' یا جیسا کہ اصطلاح میں ''جلال'' کا خیال بھی اس کے دل پر چھا جاتا ہے اور محبت کے ساتھ ادب (Respect) کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس ''خوف'' سے کہ مبادا محبوب دھتکار دے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم انداز فضل رب

میں اللہ سے ادب کی توفیق کی دعا کرتا ہوں اس لیے شیطان نے اس کے حضور گستاخانہ جواب دیا اور فضل سے محروم ہو گیا۔

بے ادب تنہا نہ شد رسوا درد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

بے ادب نہ صرف آپ ہی ذلیل اور راندۂ درگاہ ہوا بلکہ تمام عالم انسانی کی گمراہی کا موجب بنا اور ایک سرے سے دوسرے تک آگ لگا دی۔

جمال محبوب تو محبّ کو قریب اور قریب تر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جلال اسے حد ادب سے بڑھنے نہیں دیتا۔ وہ اسی ادب کے جذبات کے ساتھ قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

Marfat.com

یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ جس شے کی محبت انسان کے دل میں ہوگی، اسی کے اخلاق سے رنگین ہو جائے گا اور جب محبت کا غلبہ زیادہ سے زیادہ ہوگا تو محبوب کا تصور، جس کو اصلاح میں ''تذکر و تفکر'' کہتے ہیں، ہر وقت پیش نظر رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی کو بھول جائے گا اور صرف مطلوب رہ جائے گا۔ مولانا رومیؒ کہتے ہیں کہ:

اے برادر تو ہمیں اندیشہ ما بقا تو استخواں و ریشہ
گر گل است اندیشہ تو گلشنی در بود خارے تو ہمہ گلخنی

مولانا جامیؒ (لائحہ ششم) کہتے ہیں:

گر در دل تو گل گزر و گل باشی در بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است روزے چند اندیشۂ کل اگر کنی کل باشی

اسے اصطلاحِ تصوف میں ''فنا'' کہتے ہیں کہ طالب حق کے باطن پر نور ظہور ہستی پرتو افگن ہوتا ہے تو متخلق باخلاق الٰہیہ ہوتا ہے اور اسی طرح اپنی ہستی کو حق کی ہستی میں فنا کر کے بقا باللہ حاصل کرتا ہے۔ جیسے ایک قطرہ بحر میں محو ہو جائے تو بحر بن جاتا ہے۔

آں را کہ فنا شیوہ و فقر امیں است نے کشف و یقیں نہ معرفت نہ دیں است
رفت او زمیاں ہمیں خدا ماند خدا الفقر او اتم ہو اللہ ایں است

کسی بزرگ نے کسی سے پوچھا کہ ''تم مشتاق ہو؟'' کہا کہ ''شوق تو غائب کا ہوتا ہے۔ جب غائب حاضر ہو تو شوق غائب ہوگا۔ پیاسے کو پانی کی طلب ہوتی ہے اور مطلوب غائب ہوتا ہے، تو طلب حاضر، جب مطلوب حاضر ہوگا تو طلب غائب ہو گی۔ پانی پی لیا تو مطلوب و طالب و طلب ایک ہو گئے۔

آں نہ رویئست کہ من وصف جمالش دانم
ایں حدیث از دگرے پرس کہ من حیرانم
(سعدیؒ)

=====

Marfat.com

اصطلاحات و ارشادات

ہر ایک علم وفن کی اپنی زبان اور اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اسی طرح علم تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات اکثر آیات قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔ اور قرآن مبین میں بھی دو قسم کی آیات ہیں۔ ایک ''متشابہات'' اور دوسری ''محکمات'' متشابہات میں چند اصطلاحات ہیں جو اہل کتاب کی کتب مقدسہ میں استعمال ہوئی ہیں اور ''تاویل'' کی محتاج ہیں۔ ان کی تاویل قرآن حکیم محکمات سے فرماتا ہے۔ اصطلاحات متشابہات بہت ہیں۔ مثلاً کلمہ، روح، جبرئیل، وحی، ملائکہ، جن، شیطان، جہنم، جنت۔ ان اصطلاحات کی تاویل علماء نے اپنے اپنے فہم کے مطابق کی ہے اور صوفیہ کرام نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی حرف آخر نہیں۔ لیکن جو کچھ تشریح کی ہے، وہ زیادہ فہم اور عقل کے قریب ہے۔ ہمیں ان میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اصطلاحات جو قرآنی محکمات میں استعمال ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر علم تصوف میں لی گئی ہیں۔ اور یہ تمام علمی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً تذکر وعبرت وتدبر وتفکر، غیب وشہادت وریب وشک وشبہ ویقین وعلم وتوحید وکفر وشرک، ایمان وغیرہم۔ یہ ایسی اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم واضح ہے اور ان کی وضاحت آیات قرآن مجید میں بھی کی گئی ہے۔ اس لیے ان کے فہم میں بظاہر کچھ الجھن نہیں۔ لیکن اگر تامل سے کام لیا جائے تو یہی وہ اصطلاحات ہیں جن کی تشریح علماً وعملاً مشکل ہے اور علماء نے اس موضوع پر دفتر لکھے ہیں۔ تصوف کی اصطلاحات سیر آفاقی و سیر انفسی ومراقبہ ومشاہدہ وغیرہم بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں

Marfat.com

مختصر مگر فہم و تفہیم کے لیے کافی بحث کی ہے۔ اگر ہم ہر ایک اصطلاح کو موضوع بنائیں تو دفتر درکار ہے۔ ہم نے ان پر علیحدہ بھی بحث کی ہے۔ اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مقصد تو صرف اتنا ہے کہ طالبان حق علم تصوف سے واقف ہوں۔

کچھ اصطلاحات کی تشریح تو ہم نے اسی کتاب میں کر دی ہے۔ بعض اصطلاحات ایسی ہیں کہ تشبیہ و استعارہ و اشارات ہیں۔ سلف صالحین تو ان سے واقف نہ تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی تصانیف میں ان کا وجود ہی پایا نہیں جاتا۔ لیکن جب علم تصوف مدوّن ہوتا گیا، ان کا استعمال بھی ناگزیر امر تھا۔ چونکہ صوفیائے کرام میں اکثر اچھے پایہ کے اہل قلم ادیب بھی گزرے ہیں، انہوں نے اپنے جذبات کو شعر و شاعری میں ظاہر کیا جو ویسے بھی دل کش فن لطیف ہیں۔ شاعری تو جذبات کے اظہار ہی کو کہتے ہیں اور تصوف میں محبت اصل اخلاق ہے۔ شعر سے بہتر جذباتِ محبت کے اظہار کا آلہ کار اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس لیے صوفیوں نے اس فن میں بھی خوب دادِ سخن دی اور فارسی شاعری کا موضوع تصوف کو بنایا۔ اس سے فارسی شاعری کو چار چاند لگ گئے۔

کہتے ہیں کہ تصوف میں اشعار سب سے پہلے سلطان ابوسعید ابوالخیرؒ (متوفی ۴۰۴ھ) نے کہے۔ میں نے آپ کی رباعیات کا اردو ترجمہ اور شرح لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔ اُن ایام میں یہ منشی فاضل کے نصابِ تعلیم میں داخل تھی۔ ان رباعیات میں کچھ رباعیات مولانا جامیؒ کی بھی شامل ہو گئی ہیں، جو لوائحہ میں موجود ہیں۔ مولانا کی رباعیات میں تو تصوف کی اصطلاحات بے تکلف استعمال کی گئی ہیں مگر سلطان ابوسعیدؒ کی رباعیات ان سے معرّا ہیں اور سادہ جذبات سادہ الفاظ میں ادا کیے گئے ہیں۔ حکیم سنائی غزنویؒ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ جب تصوف سے واقف ہوئے تو سونے پر سہاگہ، کلام میں کچھ اور لطف پیدا ہو گیا۔ مولانا رومیؒ نے مثنوی معنوی آپ ہی کی کتاب "حدیقہ" کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں۔

نیم جوشی کردہ ام من نیم خام — از حکیم غزنوی بشنو تمام

لیکن حق تو یہ ہے کہ مولانا کے کلام میں شاعری کی وہ جھلک نہیں جو حکیم غزنویؒ کے اشعار میں ہے۔ مگر:

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

Marfat.com

مولاناؒ کا پایہ قبولیت اور اظہارِ حقائق اور تفصیل میں بڑھا ہوا ہے۔ حکیم غزنوی کے کلام میں صرف جذبات ہی نہیں بلکہ فلسفہ بھی ہے، جس کو مولانا رومؒ نے آب وتاب سے نمایاں کیا؛ جسے حجۃ الاسلام امام غزالی کچھ عرصہ پیشتر نثر میں بیان کر چکے تھے۔ سنائی (متوفی ۵۰۵ھ) کے بعد اوحدالدین کرمانی (متوفی ۵۳۶ھ) اور خواجہ فریدالدین عطار نے مسئلہ وحدت الوجود کو اپنے کلام کا موضوع قرار دیا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

عطار روح بود و سنائی دو چشم اُو ما از پے سنائی و عطار می ردیم

خواجہ عطار کا مرتبہ صوفیائے محققین میں مسلم ہے۔ آپ کی مثنوی ''منطق الطیر'' بہت مقبول ہوئی، جس میں استعارہ ہی سے کام لیا گیا ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود اس وقت تک ایک راز ہی تھا۔ جس کو خواجہ عطار نے سر بازار فاش کیا اور جو جوش وخروش آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ وہ کسی اور شاعر کے اشعار میں بمشکل ملے گا۔

چشم بکشا کہ جلوہ دیدار متجلی است از در و دیوار
اُو بہ پیش تو ایستادہ چو سرد سر فرو بردہٴ تو نرگس دار

یہ قصیدہ طویل ہے فرماتے ہیں:

ہر کہ از ردئے نزد اناالحق سر او بود از جماعتِ کفار
ہر کہ نادیدہ نام او گوید مشرک است اُو فضول ناہنجار

عراقی، سعدی، عارف رومی، محمود شبستری، امیر خسرو اور حسن دہلوی، شاہ نعمت اللہ ولی (متوفی ۸۳۴ھ) اور مغربی (متوفی ۸۰۹ھ) مولانا جامیؒ اور خواجہ شمس الدین حافظ نے تصوف کے مقامات رضا وفنا ومحویت وحیرت استغراق و بقاباللہ کو مختلف دل کش پیرایہ میں بیان کیا۔ دیوانِ حافظ کی شرح اور ترجمہ اُردو بھی میں نے کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ اب شاعری میں تشبیہ واستعارہ نے اصطلاحی صورت اختیار کر لی۔ شراب وشاہد وشمع وساقی اور اس کے لوازمات میں ایک گونہ کیف ہے۔ جب مسائل ومقاماتِ تصوف کو انھی الفاظ میں بیان کیا گیا تو کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس لیے ان اصطلاحات و استعارات وغیرہ سے بھی واقفیت کچھ ہونی چاہیے تا کہ ان حضرات کے کلام میں جو نکات ومعارف یا ''سِرّ دلبراں'' اور ''حدیثِ دیگراں'' بیان کیے گئے ہیں، ان سے طالب حق

Marfat.com

لطف اندوز ہوں۔ خوش قسمتی سے علامہ محمود شبستریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) نے ''گلشن راز'' میں اس کی تشریح فرما دی ہے۔

''گلشن راز'' ان ۱۷ مسائل تصوف کا جواب ہے جو میر حسینی ہروی نے علامہ محمود سے دریافت کیے تھے۔ ان میں سے تیرھواں سوال تحقیق حقائق کے بارہ میں یہ ہے کہ:

چہ خواہد مرد معنی زیں عبارت   کہ دارد سوئے چشم ولب اشارت
چہ جوید از رخ و زلف وخط و خال   کسے کاندر مقاماتست احوال؟

یعنی وہ حضرات جو حقائق سے آگاہ ہیں، جب کلام کرتے ہیں تو چشم ولب و رخ وزلف و خط و خال کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص جو مقامات کے حالات سے واقف ہیں کیوں یہ استعارات استعمال کرتے ہیں؟ ان کا مدعا کیا ہے؟ جواب میں علامہ فرماتے ہیں کہ:

ہر آں چیزے کہ در عالم عیاں است   چو عکسے آفتاب آں جہان است

اس مادی کائنات میں جو محسوس ہو رہی ہے ہر ایک شے ایک اور ہی جہان کا عکس یا ظل ہے، جیسے آفتاب کا سایہ ہوتا ہے۔

یعنی جو کچھ اس کائنات میں ظاہر محسوس ہوتا ہے وہ ذات وصفات کے انوار کا عکس ہے۔

جہاں چوں خط وخال وزلف وابروست   کہ ہر چیزے بجائے خویش نیکوست

یہ جہاں یوں سمجھو کہ ایک انسان کبیر ہے اور اس کے حسن صورت کے لوازمات میں رخ وخط وخال وزلف وابرو ہیں کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ خوبی حسن کا اظہار کر رہا ہے اور جو کچھ ہمیں ان لوازمات حسن کے خصایص معلوم ہیں، وہی اشارات میں مطلوب ومتصور ہیں۔ مثلاً آنکھ کا کام ہے مشاہدہ، اس لیے اس سے مراد شہودِ حق ہے۔ اور ابرو چونکہ آنکھوں پر حجاب ہیں اس لیے اشارۂ حجاب ہی کی طرف ہے جو صورت اشیاء حقائق اشیاء پر ہیں اور لب سے چونکہ نفس کی آمد ورفت جاری ہے جس سے رشتہ حیات وابستہ ہے، اس لیے اس سے مراد نفس رحمانی ہے۔ زلف سے مراد تجلی جلالی ہے۔

تجلی گہ جمال وگہ جلال است   رخ وزلف آں معانی را مثال است

Marfat.com

رخ سے اشارہ تجلی جمالی کی طرف ہے اور یہ سراسر لطف و رحمت ہے اور زلف سے مراد تجلی جلالی ہے کہ قہر و غضب ہے۔ عاشق تو جلوۂ روئے تاباں میں محو ہوتا ہے۔ جب زلف پریشان ہو کر اسے حجاب میں لے لیتی ہے تو دلِ عاشق پر بھی ظلمت و پریشانی طاری ہو جاتی ہے۔

بہ لوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید
زتابِ جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

یہ دو وصف جو مہر دیوں کے حسن کے لوازمات رخ و زلف میں پائے جاتے ہیں اشارات ہیں۔ ان سے مراد حق تعالیٰ کے صفات لطف و قہر ہیں۔ اس شعر میں ''بتاں'' سے مراد صفات یا آیات کتاب کائنات ہیں۔

آرزو خوں گشتۂ نیرنگ وضع ناز کیست — غمزہ دارد ''دور باش'' وجلوہ می گوید ''بیا''
چہ محسوس اند ایں الفاظ مسموع — نخست از بہر محسوس اند موضوع

چونکہ ''حقیقت مجردہ'' کا احساس ہمارے لیے ناممکن ہے۔ معانی کا انکشاف بلا کسوت عبارات محال ہے، اس لیے جو کچھ ہمیں محسوس ہو رہا ہے وہ تو ہیں صورتیں۔ ان صورتوں میں حقائق رونما ہوتے ہیں۔ اسی طرح حروف میں معانی کا اظہار ہم پر ہوتا ہے۔

''برون لفظ محال است جلوہ معنی — ہماں زکسوت اسما طلب مسمی را''
''رسیدہ ایم زاسما بفہم معنی خویش — گرفتہ ایم زعنقا سراغ عنقارا''
(بیدلؒ)

آیہ ''وعلم ادم الاسماء کلھا (۱/۴) کا بھی یہی مفہوم ہے کہ آدم کو تمام محسوسات نظری و عقلی کی حقیقت ''کلیہ'' سکھا دی۔ اہل علم و حکمت ''جزئیات'' کی کثرت میں ''کلیات'' کی وحدت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جب تک اس ''وحدت'' کا انکشاف ان پر نہ ہو کسی شے کی معرفت بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کثرت میں وحدت کا مشاہدہ ہی حقیقی علم ہے۔

شوخی آثار معنی بے عبارت مشکل است
فاش تر گوئیم اوہم اوست تا مائیم ما
(بیدلؒ)

Marfat.com

بیدلؒ نے اس شعر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ معانی الفاظ کی صورت ہی میں جلوہ افروز ہوتے ہیں، اس لیے حقیقت انہی صورتوں میں رونما ہو رہی ہے جو محسوس ہو رہے ہیں۔ ان صورتوں سے حقیقت کا ذوق ہم جدا نہیں کر سکتے، اس لیے جب تک ''ہم'' ہیں حقیقت بھی ہم میں جلوہ نما ہو رہی ہے۔ اگر ''ہم'' یعنی صورتیں نہ ہوں تو حقیقت بھی ''کنج خلوت'' ہی میں رہتی۔ اگر مخلوق نہ ہوتو اسے خالق کون کہے گا۔ لیکن یہ صورتیں یا محسوسات کیا ہیں، محض سایہ ہیں اور نمود بے بود۔ مگر اسی سایہ سے آفتابِ حقیقت کی موجودگی کا شعور ہمیں ہوتا ہے۔ ''ظل'' پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

علامہ محمود کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ زلف ورخ وخال وغیرھم ایسے الفاظ ہیں جو بذریعہ حسِ سمع ہم سن رہے ہیں اور ایسی ہی صورتیں ہیں جیسی ''حسِ بصر'' میں رنگ و روپ۔ یہ الفاظ اس لیے وضع ہوئے ہیں کہ جو کچھ ان کی حقیقت ہے، اس کا شعور ہمیں ان الفاظ کے سننے سے ہو۔

دریں گلشن کہ رنگش ریختند از گفتگو بیدل
شنیدنہاست دیدنہا و دیدنہا شنیدنہا

''ندارد عالمِ معنی نہایت
کجا بیند مراد رالفظِ غایت''

''عالم معنی'' سے مراد حقیقۃ الحقایق یا عالم ذات منزہ از اسماء صفات ہے جس کو ''ذات بحث'' اصطلاح میں کہتے ہیں۔ چونکہ اس عالم میں تمام اشارات منقطع ہیں۔ اس لیے اس کی معرفت محال ہے۔ پس ایک کیفیت ہے جو ذہن میں آئی ہے۔ جسے شیخ سعدیؒ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ

''پیش بیناں بارگاہ الست پیش ازیں رہ نبردہ اند کہ ''ہست''

لیکن اسماء صفات جو ''کلمات'' الٰہیہ میں نامتناہی اور غیر محدود ہیں، ان پر بھی الفاظ سے احاطہ نہیں ہوسکتا اور ہر ایک معنی کے درجات بھی بے نہایت ہیں۔ ان کا علم بھی ہر ایک محقق کو تاحد نظر ہی ہوتا ہے۔

''ہر آں معنی کہ شد از ذوق پیدا کجا تعبیر لفظی یا بداورا''

Marfat.com

ایسے معانی جو ذوق اور وجدانی طریق سے منکشف ہوں، وہ لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتے۔

''چو اہل دل کند تعبیر معنی　　بمانندی کند تفسیر معنی''

ایسے معانی جو اہل دل پر ذوق اور وجدانی طریق سے منکشف ہوتے ہیں جب طالبانِ حق کو سمجھاتے ہیں تو امثال بیان کرتے ہیں، جن سے وہ پہلے ہی محسوسات میں روشناس ہوتے ہیں اور ان کو ان معانی سے کچھ مناسبت بھی ہوتی ہے۔

کہ محسوسات ازآں عالم چو سایہ است　　کہ ایں چوں طفل وآں مانند دایہ است

محسوسات اس جہاں کے سایہ کی طرح ہیں۔ یوں سمجھو کہ محسوسات طفل ہیں اور وہ جہاں اس کی دایہ ہے جو اس کی ربوبیت کرتی ہے۔

زروئے وزلف خود صد روز وشب کرد　　بسے بازیچہائے بوالعجب کرد

اشارات میں اگر اس کے رخِ روشن سے مراد روزِ روشن اور زلف سے مراد شب لی جائے تو ظاہر ہے کہ نور وظلمت اضداد ہیں مگر حسن دونوں میں ایک ہی ہے۔

مطلع حسن میں گیسو بھی رخسار بھی ہے
روزِ روشن بھی ہے موجود شب تار بھی ہے

رخ ایں جا مظہر لطف خدائیست　　مراد از خط جناب کبریائیست
رخش خطے کشید اندر نکوئی　　کہ از مانیست بیرون خوبروئی

''رخ'' مظہر لطف خدا ہے اور ''خط'' تعینات عالم ارواح ہیں جو بظاہر رخ کے گرد ہالہ ڈالے ہوئے ہے اور ویسے بھی مراتب وجود میں اقرب ہیں۔ سبزہ زار طبقہ نباتات میں اوّل نشو ونما پاتے ہیں، مرتبہ غیب وشہادت کے درمیان مرتبہ برزخ بھی عالم ارواح ہے۔

زتاریکی زلفش روز شب کن　　زخطش چشمہ حیواں طلب کن

چونکہ زندگی روح سے ہے، اس لیے خط سے مراد مظاہر اسم حیات ہیں۔

سعدیؒ کہتا ہے کہ:

''آب چشمہ حیواں دروں تاریکی است''

تاریکی بھی عالم تعینات ہے

چودھواں سوال شراب و شمع و شاہد وخرابات کے بارہ میں ہے۔ جواب یہ ہے کہ:

شراب و شمع و شاہد عین معنی است　　که در ہر صورتے او را تجلی است

شراب و شمع و شاہد عین حقیقت ہے کہ ہر ایک صورت میں وہی ایک حقیقت جلوہ نما ہے۔

شراب ایں جا زجاجہ، شمع مصباح　　بود شاہد فروغ نور ارواح

اس شعر میں اشارہ سورہ نور کی طرف ہے۔ شراب بھی شیشہ میں ہوتی ہے، شمع بھی شیشہ فانوس میں ہے۔ دونوں چھلکتی اور جھلکتی ہیں۔

شراب بے خودی درکش زمانے　　مگر از دست خودیابی امانے

شراب کا اثر مدہوشی و مستی ہے۔ اس لیے جام فنا نوش کر، تا کہ اس خودی سے جو تجھے اصل سے دور رکھتی ہے اور تو بھی ''انا الموجود'' کا دعویٰ کرتا ہے، نجات حاصل ہو اور تو واصل بحق ہو۔

بخور مے تا زخویشت وا رہاند　　وجود قطرہ با دریا رساند

وہ شراب معرفت پی کہ تو اپنی ہستی موہومہ سے غافل ہو جائے۔ تیرا وجود ایک قطرہ معین و متشخص ہے۔ جب تو بحر حقیقت میں جا ملے گا تو بحر بن جائے گا۔

شرابے خور کہ جامش روئے یاراست　　پیالہ چشم مست بادہ خوار است

غالب کہتا ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ تمام اشارات ہیں۔ ''رو'' فارسی میں عربی ''وجہ'' ہے۔ ''کل شی ھالک

Marfat.com

الا وجه'' اور ''کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام''۔ ان آیات میں اشارہ اسی طرف ہے۔

شرابے را طلب بے ساغر و جام   شراب بادہ خوار ساقی آشام

اس شعر میں آیہ ''سقٰہم ربھم شراباً طھوراً'' شراب تو اصل حقیقت اور مقصود بالذات ہے اور مینا و ساغر تعینات۔ ان تعینات کے ذریعہ شراب نوشی کی ضرورت نہیں۔

ما دَر پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم   اے بے خبر زلذتِ شربِ دوام ما

پیالہ سے مراد ''قلب'' ہے جس میں حسن رخ یار کا عکس پڑتا ہے۔ لیکن یہ حسن تو پیالہ سے باہر ہی ہے۔ عکس دیکھنا تو ''دیدار'' نہیں ہوسکتا۔ ساقی جب حق تعالیٰ خود ہو، اس کے ہاتھ سے جام شراب طہور ملے تو کچھ بات ہے جو ظلمت و کدورت ہستی و خود پرستی کی آلایش سے طاہر و مطہر کر دے۔

دماغ اس کا ہے، عیش اس کا ہے، نشہ زندگی اس کی
جو مے آشام تیرے ہاتھ سے اک جام لیتا ہے

ہمہ عالم چو یک خُم خانہ اُوست   دل ہر ذرۂ پیمانہ اُوست

تمام عالم غیب وشہادت اسی کا مے خانہ ہے اور اس میں شراب ہستی حق ہے۔ ہر ایک کو بقدر و اندازہ اس شراب سے نصیب ہوا۔

ملایک خوردہ صاف از کوزہ پاک   بجرعہ ریختہ دردی بر ایں خاک

اس شعر میں تلمیح یہ ہے کہ مے خوار جب شراب پیتے ہیں تو پہلے تھوڑی سی زمین پر چھڑک دیتے ہیں، حافظ کہتا ہے کہ

اگر شراب خوری جرعہ فشاں برخاک   ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

اگر تو شراب پیے تو پہلے ایک گھونٹ زمین پر چھڑک۔ ایسے گناہ کا جس سے غیر کو نفع ہو کیا مضائقہ ہے۔

Marfat.com

خاک سے مراد آدم خاکی ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

ملائکہ کو شراب حمد و تقدیس و تسبیح جو صاف و پاک ہے، پیتے ہیں اور ''دُرد'' یعنی تلچھٹ کا ایک گھونٹ زمین پر بھی چھڑک دیا کرتے ہیں۔

خراباتی شدن از خود رہائیست خودی کفراست اگر خود پارسائیست

یہ عمارت ہستی موہوم جس کو انسان موجود سمجھتا ہے، نمود بے بود ہے۔ جب تک اس عمارت کو خراب نہ کیا جائے، ہستی، جو حقیقی ہے، منکشف نہیں ہوتی۔ اس لیے خرابات سے مراد ''خودی'' ہے کہ تو ہم سے رہائی ہے۔ کیونکہ خودی گو وہ مقتضیات طبعی ہے، اس لیے کفر ہے کہ اضافت ہستی و فعل اپنی طرف باطل ہے۔

نشانی دادہ اندت از خرابات کہ التوحید اسقاط الاضافات

یہ قول حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ کا ہے کہ توحید کیا ہے، اضافاتِ صنعتِ وجود کو مٹانا۔

خرابات از جہاں بے مثالیست مقام عاشقاں لا ابالی است

خرابات مقام وحدت ہے۔ ''لیس کمثلہ شي'' اور یہ منزہ ہے۔ مثالی اور خیالی صورتوں سے اور اس مقام پر جب قید صورت اٹھ جاتی ہے تو یہ مقام آزاد حضرات کا ہے۔

در خرابات مغاں نور خدا مے بینم دیں عجب بیں کہ چہ نورے زکجا مے بینم
(حافظ)

پندرھواں سوال بت اور زنار کے بارہ میں ہے۔

بت و زنار و ترسائی دریں کو ہمہ کفر است ورنہ چیست برگو

یہ جو ارشادات میں بت اور بت پرستی اور اس کے لوازمات کا ذکر کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کفر کی باتیں ہیں۔ اگر نہیں تو بتاؤ کس لیے نہیں؟

جواب یہ ہے کہ:

بت ایں جا مظہر عشق است و وحدت   بود زنار یستن عین خدمت

''بت'' کی اصل ''بدھ'' ہے۔ جب اہل فارس نے، جن کی حکومت شمالی ہند یعنی پنجاب پر عرصہ تک رہی یہاں مہاتما بدھ کی مورتیاں دیکھیں، جن کی پوجا عام تھی تو اس لفظ کو اپنے لب ولہجہ میں ''بت'' موسوم کیا۔ اصطلاح میں ''بت'' سے مراد عالمِ صورت ہے اور اشعار محولہ بالا میں مذکور ہو چکا ہے کہ حسن صورت اور اس کے لوازمات خط و خال اور رخ و زلف میں ایک کشش ہے۔ اس کشش کا نام عشق ہے۔ لیکن ظاہر پرست یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حسن دلکش انہی صورتوں میں ہے۔

لطیفہ ایست نہائی کہ عشق از ذخیرد
کہ نام آں نہ لب لعل و خط نگاریست
(حافظ)

ان صورتوں میں ایک حقیقت رونما ہو رہی ہے اور وہی دلوں کو کشش کرتی ہے۔ مگر اس کا شعور ظاہر پرستوں کو نہیں۔ اہل نظر اس حقیقت کا مشاہدہ ان صورتوں میں کرتے ہیں اور ہم بیان کر آئے ہیں کہ حقیقت مجردہ کا احساس بلا صورت ممکن نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہم ان صورتوں کو حقیقت سے جدا نہیں کر سکتے اس لیے یہ بھی بت پرستی ہی ہے۔ اصطلاح میں بت انبیاء واولیاء کو بھی کہتے ہیں۔ جن کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔

لیکن علامہ محمود شبستری کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عشق سے مراد ''حقیقتِ مطلقہ'' ہے اور تمام اشیاء کائنات میں یہی نورِ حقیقت جلوہ افروز ہے۔ اس لیے تمام مظاہر مظہرِ عشق ہیں اور مظہر حق ہیں۔ اس لیے اہل کمال کی توجہ پہلے انہی کی طرف ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ حق پرستی ہے مگر ظاہر میں یہ صورت پرستی بھی ہے لیکن اہل معرفت اسے جائز سمجھتے ہیں۔

چہ کفر و دیں بود قائم بہستی   شود توحید عین بت پرستی

حقیقت صورتوں میں محجوب ہے اور ''کفر'' کے معنی ہی ''حجاب'' ہے اور یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کفر ہو یا دین ان کا شعور اسی ہستی کے ساتھ ہی ہے اور ہستی میں حقیقت ہی جلوہ افروز ہے تو کفر و دین میں امتیاز اعتباری ہی ہے۔

Marfat.com

چو اشیاء ہست ہستی را مظاہر　　ازاں جملہ یکے بت باشد آخر

چونکہ تمام موجودات ہستیٔ حق کے مظاہر ہیں اور بت ان سے کوئی جدا شے نہیں۔ تو بت میں بھی شانِ خدا ہی ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو کافر اس کی پوجا ہی کیوں کرتے۔

نکو اندیشہ کن اے مردِ عاقل　　کہ بت از روئے ہستی نیست باطل

اشارہ آیہ مبارکہ ''ربنا ماخلقت هذا باطلاً'' کی طرف ہے۔ جب کوئی شے باطل نہیں تو بت بھی از روئے ہستی باطل نہیں۔

بداں کایزد تعالیٰ خالق اُوست　　زنیکو ہر چہ صادر گشت نیکوست

اس لیے ان صورتوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی لیے اس نے ہر ایک شے ''احسن صورت پر ہی خلق کی ہے۔

خوش نویس است ونخواہد بد گوست

کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں ہے۔

وجود آنجا کہ باشد محض خیر است　　اگر شریست دردے اوز غیر است

وجود تو محض خیر ہی ہے اور اگر اس میں شر ہے تو وہ غیر کی وجہ سے ہے۔

مسلماں گر بدانستے کہ بت چیست　　بدانستے کہ دیں در بت پرستیست

دگر مشرک زبت آگاہ گشتے　　کجا در دیں خود گمراہ گشتے

ندید او از بت الاخلق ظاہر　　بدیں علت شدند اندر شرع کافر

توہم گر زد نہ بنی حق پنہاں　　بشرع اندر نخواندت مسلماں

ہمیشہ کفر در تسبیح حق است　　وآں من شے گفت اینجا چہ دق است

برایں خوبی رخ بت را کہ آراست　　کہ گشتے بت پرست او حق نمی خواست

ہمو کردہ، ہمو گفت و ہمو بود　　نکو کردہ، نکو گفت و نکو بود

یکے گوئی و یکے بیں و یکے واں　　بدیں ختم آمد اصل فرع ایماں

Marfat.com

ان اشعار کا یہ مفہوم ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ تمام کائنات کا خالق حق تعالیٰ ہے اور حق سے یہ امر بعید تر ہے کہ باطل پیدا کرے۔ ''باطل از باطل بر دید حق زحق'' اس لیے عالم غیب وشہادت میں جو کچھ بھی ہے حق ہے اور اہل ذکر وفکر بھی یہی کہتے ہیں کہ ''ربنا ما خلقت هذا باطلاً ''اور قرآن کی شہادت بھی موجود ہے کہ ''ذٰلک ظن الذین کفرواً '' وجود خیر محض ہے۔ سوال یہ ہے کہ شر کہاں سے آ گیا؟ یہ مسئلہ ''خیر وشر'' دقیق ہے اور سمجھنے کی بات ہے۔ اسی پر تمام علوم تصوف کا مدار ہے۔

خیر و شر

چونکہ ہر ایک امر کا رجوع حق تعالیٰ کی طرف ہے۔ ''کل شی یرجع الی اصلہٖ'' ہر ایک شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے، اس لیے خیر وشر کی نسبت بھی اس کی طرف ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ خیر وشر صرف نسبتی امور ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تمام کائنات کا ظہور ہی ''انساب'' سے ہوا ہے۔ قرآن حکیم کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلق فرماتا ہے اور انسان کسب کرتا ہے۔

''کل امری بما کسب رهین '' ہر ایک آدمی جو شے کہ کسب کرتا ہے، اس کا گرویدہ ہے۔ (۲۷/۳)

''لا یواخذکم الله باللغو فی ایمانکم، ولکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم والله غفور حلیم ''(۲/۱۲) اللہ تمہاری لغو قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا لیکن جو کچھ تمہارے دل کسب کرتے ہیں، اس پر مواخذہ فرماتا ہے اور اللہ بخشنے والا تحمل والا بھی ہے۔

''توفی کل نفسٍ ماکسبت وهم لایظلمون ''(۳/۶) ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے اس کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور اس پر ظلم نہ ہوگا۔

''وما اصابکم من قصیبةٍ فما کسبت ایدیکم ''(۲۵/۵) اور چونکہ تم پر مصیبت پڑتی ہے تو اس چیز کا سبب ہے جو تمہارے ہاتھ کماتے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان ان تمام آلات سے یا اعضاء سے جو اس کو عطا ہوئے ہیں، اشیاء سے وہ بات کسب کرتا ہے جس کے امکانات اشیاء میں

Marfat.com

موجود ہیں۔ مثلاً شہد میں رزق پاکیزہ بھی ہے، شفا بھی ہے اور انسان اس سے نشہ آور چیزیں بھی بناتا ہے۔ آگ ہے اس سے ہزاروں مفید کام نکلتے ہیں اور اگر کوئی چاہے تو اپنے دشمن کا گھر بھی جلا سکتا ہے۔ آگ کا کام ہے حرارت دینا اور جلانا۔ اس سے مفید کام بھی ہو سکتے ہیں۔ مضر بھی۔ ارشادِ قرآن ہے کہ:

"**لا ینفع نفساً ایمانها لم تکن امنت من قبل او کسبت فی ایمانها خیراً**" (۸/۷) کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا کہ (موت سے) پہلے ایمان نہ لایا یا اپنے ایمان میں "خیر" کسب نہ کی۔

"**والذین کسبوا السیاٰت جزآء سیۃ بمثلها**" (۱۱/۸) جو لوگ برائیاں کسب کرتے ہیں تو ان کی جزا اسی قدر سیّات ہی ملے گی (اور جو حسنات کسب کرتے ہیں ان کی جزا بہت بڑھ چڑھ کر دی جائے گی۔)

"**وان تصبهم حسنة یقولوا هذہٖ من عندالله، وان تصبهم سیةً یقولو هذہٖ من عندک، قل کل من عندالله ط فمال هؤلاء القوم لا یکادون یفقهون حدیثاً ○ ماا صابک من حسنةٍ فمن الله وما اصابک من سیةٍ فمن نفسک**" (۵/۸) اور تحقیق جب ان کو بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور جب برائی آ لگتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ میری شومی کی وجہ سے ہے۔ ہم کو کہ سب کچھ (جزا و سزا) اللہ ہی کے نزدیک ہے۔ اس قوم کو کیا ہے کہ اتنی سی بات نہیں سمجھتی کہ جو تجھے بھلائی پہنچتی ہے، وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی آ لگتی ہے تو وہ تیرے ہی نفس کی کرتوت ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ وجود خیر محض ہے۔ اللہ شر نہیں پیدا کرتا۔ اللہ نے یہ اختیار انسان کو دیا ہے کہ اس خیر کو کسب کرے اور اگر وہ اس شے کو اس کے موقع و محل پر استعمال کرتا ہے تو خیر ہی خیر ہے اور اگر غیر محل استعمال کرتا ہے تو شر ہے۔ اس لیے سیئات نفس انسانی کسب کرتا ہے۔

آگ کا خاصہ ہے جلانا اور یہ خیر ہے۔ کسی نے اپنے دشمن کے گھر کو آگ لگا دی، جو جل کر خاکستر ہو گیا اور خاکستر اڑ کر گھر معدوم ہو گیا۔ آگ کا جلانا اور گھر کا آگ کے اثر کو قبول کرنا خیر ہے۔ لیکن گھر کا معدوم ہونا شر ہے۔ اس لیے شر کو عدم سے

Marfat.com

مناسبت ہے اور خیر کو وجود سے۔ چونکہ وجود خیر محض ہے، اس لیے بت بھی، جو وجود میں شامل ہے خیر ہی ہے۔ اتنی سی بات ہے جو نہ تو مسلمان نے سمجھی نہ بت پرست نے۔ اگر مسلمان سمجھ لیتا تو ''لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ'' کا بھی فہم ہوتا اور بت پرست بھی کافر نہ ہوتا، اگر محض صورت پرست نہ ہوتا۔ اگر حقیقت پرست ہوتا تو مسلمان ہی ہوتا۔ بیدل کہتا ہے:

اگر آلودۂ احرام غیری ہمہ گر کعبہ باشی ننگ دیری

اگر تو نے غیر کا احرام اوڑھا ہوا ہے تو خواہ تو کعبہ مجسم بھی بن جائے پھر بھی بت خانہ تجھ سے ننگ کرے گا۔

اگر از وہم غیر آگاہیست نیست براہ کفر ہم گمراہیست نیست

اگر غیر کا وہم تجھے نہیں تو کفر کے راستہ پر بھی گمراہی نہیں۔

حقیقت واحدہ ہے اور کثرت میں بھی جلوہ نما ہے اور ''ہمہ کثرت ز نسبت گشت پیدا'' اگر اس نسبت کو نظر انداز کر دو تو وحدت ہے۔

وحدتِ وجود و شہود

ہم نے کسی مقام پر لکھا ہے کہ کائنات میں کوئی شے مفرد نہیں ہے اور نہ کسی مفرد شے کا تصور ذہن انسانی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر ذات حق تعالیٰ اشیاء کائنات کی مثل ہوتی تو اشیاء کی طرح ہمارے دائرہ تصور میں آ جاتی۔ وہ حقیقت مجردہ ہے۔ اس لیے ہمارے عقل و فہم اور قیاس و گمان سے بالاتر ہے۔ اہل تصوف جب یہ کہتے ہیں کہ وہ حقیقت مجردہ واحدہ ہے تو یہ ایک وجدانی کیفیت ہے اور یہ کیفیت کچھ ان کی خود ساختہ نہیں بلکہ جیسا کہ ہم نے ایک مقام پر واضح کیا ہے کہ جسے ''مادہ'' کہتے ہیں وہ صرف صورتیں ہی صورتیں ہیں جو ہم محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ احساس مادہ کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اسی نورِ وحدت کا ہے جس نے ہم کو چشم بصیرت دی ہے۔ مادہ پرست تو یہ کہتے ہیں کہ کل کائنات مادی ہے اور اس کی اصل اجزاء فردہ ہیں۔ ان اجزاء اور مادہ کی نسبت حکماء کا ہر ایک زمانہ میں نظریہ مختلف رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں حکماء کا نظریہ یہ ہے

کہ اصل کائنات ایک "قوت" (energy) ہے، جس کا خاصہ حرارت ہے اور حرارت کی کمی بیشی سے اشیاء بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اگر حرارت نہ ہو تو مادی اشیاء ٹھوس ہوتی ہیں اور اگر زیادہ سے زیادہ حرارت ہو تو پانی یا ہوا میں اشیاء تبدیل ہو جاتی ہیں اور یہی مادہ کی تین صورتیں ہیں۔ یہ قوت کائنات میں جس مقدار سے موجود ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ البتہ اس کی تقسیم کائنات میں غیر مساوی ہے۔ اس کو (fist law of thermodynamics) کہتے ہیں۔ یہ کہ حرارت کا رجحان مساوات کی طرف ہے اور ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ کل کائنات میں اس کی تقسیم مساوی ہو جائے گی۔ اس وقت "لاشمسا و لا زمھریرا" اس کو وہ (second law of thermodsnamics) کہتے ہیں۔ ہمیں سرِدست اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ مادہ کے متعلق جو کچھ ان کا نظریہ تھا، یا ہے، یا ہوگا، وہ مشاہدات اور استدلالِ عقلیہ پر مبنی ہے۔ مشاہدات کا انکار کوئی محقق نہیں کرے گا، لیکن وہ نتائج جو استدلال سے اخذ کیے جاتے ہیں، محض نظریے (theory) ہیں اور ان میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اس سے کوئی یقینی امر مرتبت نہیں ہوتا اور ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ "مشاہدہ" میں ہر ایک محقق کی حد نظر ہی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آخری حد ہے۔ لیکن اہل تصوف نہ کسی مشاہدہ کا اور نہ کسی نظریہ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ ہر ایک کا زاویہ نگاہ مختلف ہے، اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے کل کا ایک جزو ہی ہوتا ہے اور اجزاء میں کثرت ہے۔ لیکن کل واحد ہے۔ اس وحدت کا انکار کوئی حکیم نہیں کرتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک جزئیات کو کل میں محو نہ کیا جائے ہمیں کسی شے کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حکماء ہمیشہ جزئیات میں کل کی تلاش کرتے ہیں۔ جہاں تک محسوساتِ آفاقی و ذہنی کا تعلق ہے حکماء کی تحقیق باطل نہیں۔ لیکن اہل تصوف تو وہ بات کہتے ہیں، جو اس سے اعلیٰ وارفع ہے۔

"وحدت" اہل تصوف کے نزدیک ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ مگر اس کے بارہ میں ان کے دو نظریے ہیں۔ ایک وحدتِ شہود اور دوسرا وحدت وجود۔ اہل شہود بھی وحدت وجود کے منکر نہیں ہیں، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک لفظی بحث ہی ہے۔ وحدت شہود یہ ہے کہ ہستی حق تعالیٰ تو واجب الوجود ہے، جو ازلی و ابدی ہے لیکن جو کچھ مشہود و محسوس ہو رہا ہے وہ مخلوق و حادث اور وجودِ ممکنات ہے، اور اس وجود کی حیثیت

Marfat.com

بمقابلہ وجودِ مطلق ایسی ہی ہے جیسے ایک کرمک شب تاب (میاں جگنو) کی روز روشن میں۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تو دن کو باہر کیوں نہیں نکلتا۔ جواب دیا کہ میں تو دن میں بھی یہیں ہوتا ہوں، جیسا رات میں۔ مگر ضیاءِ آفتاب میں میرا نور محو ہو جاتا ہے۔ یا جیسے ستارے کہ رات کو تو نظر آتے ہیں مگر دن کو آفتاب کی روشنی میں محجوب ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے ہستی کی گتھی نہیں سلجھتی۔ واجب اور ممکن کا وجود ایک ہی ہے یا ایک کا غیر دوسرا ہے۔ اگر ایک ہی ہے تو یہ وحدت وجود کا نظریہ ہے۔ اور اگر غیر ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کے مقابل اس کا غیر بھی ہے، اور حق تعالیٰ کے مقابلہ میں باطل ہی ہوگا۔ اور اگر یہ حق تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حق تعالیٰ باطل پیدا کرتا ہے۔ اس لیے یہ نظریہ باطل ہے۔ اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ جو کچھ بھی موجود ہے، حق ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ وحدت وجود ذوقی و حالی ہے اور لفظوں میں اس کے معانی کا فہم ممکن نہیں، اس لیے بہت کچھ غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا۔ اہل تصوف نے اس کو مختلف پیرایوں اور مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بقول علامہ محمود شبستریؒ:

تراگر نیست احوال و مواجید   مشو کافر بنادانی زتقلید

بیدلؒ کہتا ہے کہ:

کثرت نہ شد فوت از سازِ وحدت   ہچوں خیالات از شخص تنہا
موجود نامیست باقی توہم   از عالم خضر رُو تا مسیحا
حیرت طراز یست، نیرنگ سازیست   تمثال اوہام، آئینہ دنیا

بیدل کے اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہماری وحدت میں ہمارے اپنے خیالات سے جو ہمارے ذہن میں ہیں، ان کے ہجوم سے کوئی فرق، کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح ذات حق تعالیٰ کی وحدت میں کائنات کی کثرت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے خیالات جس طرح بے حقیقت نہیں، اُسی طرح عالم کی کیفیت ہے کہ وہ علم حق تعالیٰ میں تو موجود ہیں مگر اس سے باہر عدم ہیں۔ یہ خیالات (ideas) حق تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں، جو ہمیں محسوسات میں مشاہدہ ہو رہے ہیں اور ہماری اپنی حقیقت بھی

Marfat.com

یہی کچھ ہے۔

حق تعالیٰ بدیع السمٰوٰت والارض ہے اور اس کا ایک اسم ''مصور'' بھی ہے۔ مصور صورتیں بناتا ہے لیکن وہ خود صورتیں نہیں ہے۔ البتہ اس کے ذہن میں یہ سب صورتیں موجود ہیں۔ وحدت وجود یہ ہے کہ ان صورتوں کو تو وجود کی خبر تک نہیں۔ وہ مصور حقیقی کے علم سے باہر معدوم ہیں۔ موجود مصور ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ مصور کے علم کا مظاہرہ ہے۔ مگر یہ مظاہرہ بھی مصور کے علم میں ہی ہے۔

بیدل کہتا ہے کہ:

ہمہ غیب است شہود ایں جا نیست جملہ اخفاست نمود ایں جا نیست

تمام کائنات کا حال پردۂ غیب میں ہے۔ ظاہر اس مقام میں نہیں، تمام اشیاء حضرت علم میں ہی پوشیدہ ہیں۔ اس سے باہر ان کی نمود نہیں۔

اصل ہر سوسن وگل نیرنگ است جز ہمیں سرخ وکبود ایں جا نیست

ہر ایک سوسن وگل کی اس چمن میں اصل نیرنگ ہے اور یہ رنگتیں سرخ وکبود ہی ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

شعلہ خاکستر محض است آخر جز دمی گرمیٔ دود ایں جا نیست

شعلہ چمک کر آخر خاک ہو جاتا ہے۔ البتہ ایک دم دھوئیں کی گرمی ہے، جو جلد سرد ہو جاتی ہے۔

نتواں جلوۂ مطلق دیدن آنکہ ایں پردۂ کشود ایں جا نیست

ذات مطلق کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا جس نے ممکنات کی ہستی کو بے نقاب کیا ہے وہ اس جگہ نہیں۔

اعتبارات ہمہ او بام اند تو عدم باش وجود ایں جا نیست

محسوسات سب خیالات ہیں۔ تو عدم ہی اپنے آپ کو سمجھ۔ وجود کائنات سے باہر ہے۔

Marfat.com

مغربی علیہ الرحمتہ نے پتہ کی بات کہی ہے کہ:

در صورت قطرہ سر بسر دریائیم   تو ذرہ مبیں مہر جہاں آرائیم

ہم قطرہ کی صورت میں سر بسر دریا ہیں۔ تو ہمیں ذرہ حقیر نہ دیکھ، آفتاب جہاں تاب ہم ہیں۔

گویند کہ کنہ ذات اُونتواں یافت   مایافتہ ایم، کنہش مائیم

کہتے ہیں کہ ذات کی کنہ معلوم نہیں ہوسکتی۔ ہم نے دریافت کرلی۔ اس کی کنہ ہم ہیں۔

یہ رباعی ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' کی تفسیر ہے۔ لیکن حضرت مغربی سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ آپ نے اپنی کنہ معلوم کرلی ہے؟

اس شعر کی لطافت اسی میں ہے کہ انسان بے شک کنہ ذات ہے مگر اس کی کنہ معلوم نہیں۔

بیدل کہتا ہے کہ:

تمثال بغیر از اثر شخص چہ دارد   خوش باش کہ خودرا تو نمودن ہنر اُوست

آئینہ میں ہم اپنی صورت دیکھیں تو یہ ہماری شخصیت کا اثر یا عکس ہے۔ آئینہ تمام کائنات ہے اس کائنات میں تمثال دیکھنے والا انسان ہے لیکن اس آئینہ کے سامنے خود انسان ہے اور یہ تمثال اسی کی ہے جو وہ دیکھ رہا ہے۔ دیکھنے والا وہ شخص یا ذات ہے جو انسان کی آنکھ سے کائنات میں اپنی تمثال دیکھ رہا ہے۔ ''خودرا تو نمودن ہنر اُوست'' یہ خالق کائنات کی صفت کاملہ ہے۔

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذتِ شراب دوامِ ما
(حافظؒ)

پیالہ سے مراد قلب انسانی ہے جس میں کائنات کا عکس یا نقش ہے۔ اور اسی عکس میں جلوہ اسماء وصفات ذات مشاہدہ ہوتا ہے۔ خواجہ حافظؒ نے ''عکس'' کے لفظ میں

Marfat.com

یہ حقیقت واضح کی ہے کہ قلب میں خود "وجہ" یا "رخ" نہیں بلکہ اس کا عکس ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ذات آئینہ اور عکس سے باہر ہے، خود آئینہ اور عکس نہیں ہے۔ وہ حق ہے تو یہ عکس بالحق مشاہدہ ہوتا ہے۔ یعنی ہستی عالم کا قیام ذات حق تعالیٰ سے ہے۔

ہر چند کہ عنقا زخیال تو برون است   ہر رنگ کہ داری بنظر نقش پر اوست
ہر چہ آید در نظر غیر تو نیست   خود توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

علامہ محمود شبستریؒ کے اشعار محوّلہ بالا کا بھی یہی مفہوم ہے کہ آفتاب کی موجودگی ہی کے ساتھ سایہ، یا ظل، یا عکس کا قیام ہے۔ جب خود آفتاب جلوہ نما ہو تو سایہ اس کے نور میں محو ہو جاتا ہے۔ اسی کو "قیامت" یا قیام بالحق کہتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ طالبان حق ہر وقت کرتے ہیں۔

ندامے آید از حق بر دو اُمت   چرا گشتی تو موقوف قیامت

علامہ شبستریؒ کے اشعار سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ بت کی تعریف میں یہاں تک کہہ گئے کہ چونکہ بت از روئے ہستی باطل نہیں، اس لیے بت پرستی عین حق پرستی ہے۔ "پرستش" سے ان کی مراد عبادت نہیں ہے، جیسا کہ آپ نے دیگر اشعار میں وضاحت کر دی ہے۔ ہستی میں انسان کا مرتبہ سب سے ارفع و اعلیٰ ہے، یہاں تک کہ ملائکہ کیا تمام کائنات اس کے سامنے جھکتی ہے۔ اگر وہ اشیاء کائنات کے سامنے جھکتا ہے تو اپنے مرتبہ سے گر جاتا ہے۔ اسے صرف اُسی کے حضور جھکنا چاہیے جس کے حضور سب جھکتے ہیں۔ "له اسلم من فی السمٰوات والارض"۔ چونکہ ان اشعار میں عکس، یا سایہ، یا ظل کا مذکور ہوا ہے اور اہل تصوف کے نزدیک یہ عالم محسوسات اس جہاں کا عکس ہے، یا مثال ہے، جو "حقیقت" ہے، اس لیے اس اصطلاح کی تشریح مناسب ہے۔

ظل

عموماً لوگ سایہ کی نسبت خیال کرتے ہیں کہ اس کا رنگ سیاہ ہے۔ یہ صحیح نہیں اور یہ بھی عام رائے ہے کہ سایہ انہی اشیاء کا ہوتا ہے، جو ٹھوس ہوں۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ سایہ میں تین چیزوں کے رنگوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ ایک روشنی کے رنگ کی، دوسری اس شے کے رنگ کی، جس پر روشنی پڑتی ہے اور تیسرے اس رنگ کی، جو اس شے کا ہے

Marfat.com

جس پر سایہ پڑتا ہے۔ جس شے پر روشنی کی کرنیں پڑتی ہیں وہ بھی تین قسم کی ہے۔ ایک ٹھوس جیسے لوہا وغیرہ، ان کا باطن تاریک ہوتا ہے۔ دوسرے شفاف جیسے شیشہ جس سے روشنی کی کرنیں گزر جاتی ہیں۔ تیسرے صاف جس کو روشنی روشن کرتی ہے۔ سایہ کی بھی تین قسمیں ہیں اور یہ سایہ کے مدارج ہیں۔ گہرا اور ہلکا اور مدھم۔ پھر اور تین قسمیں گرم، سرد اور معتدل بھی ہیں۔ غالباً ان سب کا مذکور آیہ ''انطلقوا الی ظل ذی ثلث شعب'' (۲۹/۲۱) میں ہے۔ چلو اس سایہ کی طرف جو تین ذات کا ہے۔

سایہ پیدا کرنے والی صرف روشنی ہی نہیں آواز بھی ہے۔ یہ ایک مستقل علمی موضوع ہے، مفصل بحث کی گنجائش نہیں۔ اس کا تعلق سمع و بصر سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے ہم روشنی کہتے ہیں، جسے ہماری حسِ بصر محسوس کرتی ہے، خود سایہ ہے اور اسی طرح دیگر حواس کے احساسات ہیں جو ہمارے حواس تک کئی حجابات سے گزر کر آتے ہیں۔ ہوا اور ایتھر (eather) شفاف اشیاء ہیں۔ سورج کی کرنیں جب ان سے گزر کر آتی ہیں تو سایہ ہی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جب زمین پر پڑتی ہیں تو ان کے رنگ میں چمک ہوتی ہے۔ ہم اس کی روشنی سے موسوم کرتے ہیں۔

سایہ غیر مادی اشیاء کا بھی ہوتا ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ وہ تو اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کو بیٹی کی ولادت کی خوشخبری سنائی جائے تو غم وغصہ کے مارے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ ''ظل وجھہ مسودا'' (۱۴/۱۱۳) اس آیت میں ظل کے رنگ کو ''مسوّدا'' (سیاہ) کہا گیا ہے۔ یعنی سایہ کے بہت رنگ ہوتے ہیں۔ جن میں سے سیاہ بھی ایک ہے۔ اگر ظل کا رنگ صرف سیاہ ہی ہوتا تو ''مسوّدا'' کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ''ظل'' خود غیر مادی شے ہے اور وہ الفاظ بھی جو دَر بارہ بشارت ولادتِ دختر کہے گئے، غیر مادی ہیں اور مشرکین کے دل پر اس کا اثر بھی غیر مادی ہے اور اس اثر کا اظہار چہرہ پر بھی غیر مادی ہے۔ لیکن چہرہ مادی شے ہے اور دیکھنے والوں کا احساس بھی غیر مادی ہے۔ متکلم کے حرف وصوت کو مخاطب کے دل پر پہنچایا اور پھر دل سے چہرہ پر اثر آیا اور ناظرین کو بھی اس کا احساس ہوا۔

جب ہم کائنات پر نظر کرتے ہیں تو زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان

Marfat.com

بے شمار اشیاء محسوس ہوتی ہیں۔ ان کو ہم ''محسوسات'' کہتے ہیں جو محض صورتیں ہمارے حواس میں ہیں۔ یعنی ان اشیاء کی ظل، اور جب حواس سے ہمارے قلب پر یہ سایہ پڑتا ہے تو وہاں عکسی تصویر (فوٹو) کی طرح مثبت ہو جاتا ہے اور ''تذکر'' اسے پھر ''حافظ'' سے اپنے دیدۂ تصور کے سامنے لاتا ہے۔ محسوسات ظل ہیں حقائق کا، جن کا احساس ہمیں تذکر و تفکر سے ہوتا ہے۔ عالمِ حقائق کا سایہ محسوسات ہیں، لیکن سایہ اصل سے جدا نہیں۔

سورج نکلنے سے پیشتر روئے زمین پر جو تاریکی چھائی ہوتی ہے، وہ سایہ ہے۔ اگر یہ ساکن ہوتا تو ہمیں اس کا احساس تک نہ ہوتا۔ آفتاب کی روشنی نے اس کا احساس ہمارے ذہن میں پیدا کیا۔ اگر آفتاب نصف النہار پر ہو تو سایہ محو ہو جاتا ہے۔ اگر آفتاب ہمیشہ نصف النہار پر ہوتا تو ہمیں نہ سورج کی روشنی کا اور اگر سایہ ہمیشہ ہوتا تو نہ سایہ کا احساس ہوتا۔ اس لیے سایہ روشنی پر، اور روشنی سایہ پر دلیل ہے۔ یہ مفہوم ہے آیہ ''الم تر الی ربک کیف مدّالظلّ و لو شاء لجعله ساکنا ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا'' (۲۹/۳) کا۔ یہی کیفیت کائنات کی ہے جو سایہ ہے اور بذاتہٖ تاریک ہے۔ اس کو روشن نور نے کیا ہے جو غائب لطیف ہے۔ وہ تو ہمیں نظر نہیں آتا، اس کی روشنی میں اشیاء نظر آتی ہیں۔ یہ ہے مفہوم آیہ ''نور السمٰوٰت والارض'' کا۔

یہ ظاہر ہے کہ روشنی کے بغیر کسی شے کا سایہ یا سایہ در سایہ نہ ہوگا اور روشنی میں ہر ایک شے کا سایہ اس شے کی ہیئت ہوگی۔ اگر سایہ کثیف شے پر پڑے تو بظاہر سیاہ نظر آئے گا اور شفاف یا صاف پر پڑے تو تمثال ہوگا، جیسے آئینہ میں یا پانی میں کسی شے کا عکس۔

''ظل'' یا سایہ کئی رنگ کا ہوتا ہے۔ آیات قرآن (۲۲/۵) میں اس کے مقابل لفظ ''حرور'' (تیز گرم) استعمال ہوا ہے۔ جس کی چمکیلی روشنی ہوتی ہے۔ سورج کی کرنوں میں کئی رنگ ہیں جو لہروں میں ایتھر اور ہوا سے گزرتے ہوئے کرۂ ارض کی طرف آتے ہیں۔ نیلگوں رنگ کی لہریں چھوٹی ہوتی ہیں اور کرۂ ہوا کے اجزاء آبی بخارات اور ذرات وغیرہ سے ٹکرا کر فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ اس لیے آسمان نیلگوں نظر آتا ہے۔ طویل زوردار لہریں سرخ رنگ کی ٹکراتی ہوئی سطح زمین پر پڑتی ہیں۔ ان کی روشنی اور حرارت ہم محسوس کرتے ہیں۔ ان کو ''حرور'' کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظل سے اور ظل اس سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے نور ظلمت سے اور ظلمت نور سے۔ سورج کی

Marfat.com

شعاعوں میں تین رنگ سرخ، زرد، نیلا محفوظ ہوتے ہیں۔(''**ظل ذی ثلث شعب**'' ۲۹/۲۱) ہمارے سماء الدنیا اور فضا میں جو دل لبھانے والی خوب صورتی مشاہدہ ہوتی ہے، وہ اسی ظل کا کرشمہ ہے۔ صبح و شام افق پر شفق، بادلوں میں رنگینی وغیرہ بھی ظل ہے۔

اکثر حضرات نے خارج میں خاص خاص مقامات پر دن یا رات کے کسی حصہ میں عجیب وغریب شکلیں یا آوازیں سنی ہوں گی۔ یہ بھی کسی واقعہ کی ''ظل'' ہے اور اسی طرح محفوظ ہے جس طرح اشیاء کائنات کی ہمارے قلب میں۔

کسی شے کا سایہ اس وقت دکھائی دیتا ہے جب روشنی اس کی دائیں یا بائیں سمت سے پڑے، جیسے صبح و شام مشاہدہ ہوتا ہے۔ اگر آفتاب نصف النہار پر ہو تو سایہ محو ہو جاتا ہے۔ دائیں اور بائیں بے شمار نقاط اور زاویے ہیں اور روشنی اور اس شے کے درمیانی فاصلہ کا اثر بھی سایہ پر پڑتا ہے۔ انہی حقائق سے ہم کسی شے کا طول و عرض بھی معلوم کرتے ہیں اور اسی نسبت سے سایہ طول و عرض میں کم و بیش ہو گا۔ غرض تمام کائنات اور کتاب کائنات سے ماخوذ ہمارے علوم دینی ''ظل'' کے مرہون ہیں۔

تجدد امثال

یہ بھی ایک اصطلاحِ علم تصوّف ہے۔ ہر ایک شے پر تغیرات ہر آن واقع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات چونکہ بہت لطیف ہیں اور ہر ایک مثلِ موخر مقدم مثل کی مشابہ ہوتی ہے، اس لیے اس کا احساس بادی النظر میں نہیں ہوتا۔ ایک شیر خوار بچہ لڑکا اور جوان اور بوڑھا ہو جاتا ہے۔ نفس الامر میں یہ ایک ہی حقیقت ہے مگر اس کی صورتیں ہر آن بدلتی رہتی ہیں اور ان میں کبھی سکون نہیں ہوتا۔ یہ امثال یا صورتیں ''ظل'' ہیں۔ اسی پر کل عالم کو قیاس کرو جو ہر آن فنا ہوتا ہے اور اس کا مثل ہر آن بلا توقف ظہور میں آتا ہے۔ اسی میں ارتقاء کا راز مضمر ہے، اور عالم نہ صرف کبھی کہنہ اور فرسودہ نہیں ہوتا بلکہ بہ ہئیت مجموعی تروتازہ ہے اور ترقی کر رہا ہے۔

بیانِ حسن کر سکتا نہیں حسنِ بیاں پیدا
زباں آنکھیں کرے، آنکھیں کریں پہلے زباں پیدا
یہاں ہر چشمک ذرّہ میں محشر خیز جلوہ ہے
نیا ہر آن ہوتا ہے زمانہ میں جہاں پیدا

یہ اصطلاح بھی قرآن حکیم کی آیات سے اخذ کی گئی ہے۔

''نحن خلقنٰهم و شددنا امرهم و اذا شئنا بدلنا امثالهم تبديلا'' (۲۹/۲۰) ہم نے ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط بنائے اور جب چاہیں ان کی امثال بالکل بدل ڈالیں۔

چونکہ قانون تجدد امثال کے تحت ہر آن نئی پیدائش کا ظہور ہوتا ہے، اس لیے ارشاد کہ تم اپنی پہلی پیدائش کے واقعات اور حالات سے تو واقف ہو چکے ہو کہ اس سے ارتقا کرتے ہوئے انسان بنے۔

''افعيينا بالخلق الاول بل هم فی لبس من خلق جديد '' (۲۶/۱۵) تو کیا ہم پہلی پیدائش سے تھک گئے (تمہارے انکار کی وجہ یہ ہے کہ) تم نئی پیدائش کے بارہ میں شک میں پڑے ہو۔

شیخ اکبرؒ نے اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ''فصوص الحکم'' میں اپنی کتاب ''تجلیات'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ میں نے کشف میں اکابر صوفیہ جنید بغدادیؒ وغیرہ کو دیکھا کہ وہ ترقی کر رہے ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہ تھا۔ آیہ ''اوتوا به متشابها'' کی تفسیر کرتے ہوئے تجدد امثال کا مسئلہ بتایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے اور قرآن کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ارتقا کا سلسلہ جاری ہے۔ تجدد امثال سے چند امور واضح ہوتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ ہر آن خالق، مبدی و بدیع و مصور وغیرہ ہے۔ **كل يوم هو فی شان**

(۲) تجدد میں ارتقا لامحدود ہے۔

(۳) تجدد میں رجعت نہیں، یعنی ہستی میں تکرار نہیں۔

دوبارہ رونما ہوتا نہیں ہے کوئی دنیا میں
مثال اس آئینہ خانہ میں ممکن ہو تو پیدا کر

(۴) امثال ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس لیے مرنے کے بعد خلق جدید میں انسان اسی شکل و صورت سے مشابہ ہوگا۔

(۵) ہر ایک صورت اس عالم صورت میں یکتا ہے۔

اس عالم صورت میں ہر ایک شخص ہے یکتا
اک بار جو پیدا ہوا دوبارہ نہیں ہوتا

(۶) جسے قیامت کہتے ہیں، وہ کائنات کے امثال کی تبدیلی سے خلقِ جدید ہے اور ایک ارتقائی صورت ہے۔

''یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوات''(۱۳/۱۹)

اور''ہر روز قیامت است و ہر شب مردن''

(۷) کائنات تغیرات کے تحت فنا و بقاء کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

فنا اور بقا ہم بہم دیتے ہیں   کرشمہ یہی دم بہ دم دیکھتے ہیں

لیکن''الاخرۃ خیرا و ابقی''اور''خیر من الاولیٰ''

======

Marfat.com

تصوّف

تصوّف ایک ایسا موضوع ہے جس پر موافق و مخالف بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

وجہ تسمیہ

عموماً اہل علم کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تصوف دین اسلام میں ایک شاخسانہ تھا جو بعض مسلمان حکماء نے فلسفۂ یونان و ہند کے زیر اثر نکالا۔ یہ اعتراض کچھ وقیع نہیں۔ اسلام دین الفطرت، دین اللہ، دین الحق ہے۔ ''لہ اسلم من فی السمٰوات والارض ''۔ یہ کچھ ایجاد و اختراع آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں بلکہ کسی نبی اور رسول کی نہیں۔ یہ دین ان کی شخصیت سے ایسا ہی بے نیاز ہے جیسے قوانین فطرت۔ اگر حکماء نے کچھ قوانین دریافت بھی کر لیے تو وہ ان کی پیدائش سے پیشتر بھی ایسے ہی سرگرم عمل تھے، جیسے ان کی وفات کے بعد۔ اس دین کا جزواً انکشاف حسب ضرورتِ وقت تمام انبیاء اور ''کلہ'' آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ اس لیے اگر اسلام وہی ہے جو کل انبیاء و رسل کا دین تھا تو بنی اسرائیل میں مسیح کے حواریوں تک اس امر کی تاریخی شہادت ملتی ہے کہ تصوف کی ایک خاص صورت ان میں بھی نمایاں تھی۔ چنانچہ جب طالوت کو لوگوں نے انبیاء زادوں میں، جو نفیری اور دیگر مزامیر کے ساتھ جلوس کی صورت میں آ رہے تھے، بحالتِ وجد دیکھا تو حیران ہو کر کہا کہ کیا طالوت بھی ''نبیوں میں شامل ہو گیا ہے۔'' بنی اسرائیل میں یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا۔ رفع کے بعد مسیح کے حواری ایک جگہ حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ بقول فاضل ''رنیان'' شام میں طوفانِ برق عام فضائی مشاہدہ ہے۔ بجلی کی صورت ہی ''آتشین

زمانہائے دریدہ" کی عموماً ہوتی ہے۔ اس وقت بھی یہی کیفیت فضا میں تھی۔ ایک حواری نے تصور کیا کہ اس پر روح القدس کا نزول اسی "آتشیں زمانہ دریدہ" کی صورت میں ہو رہا ہے۔ وہ وجد و حالت میں آ گیا تو روح اجتماع کا اثر دوسروں پر بھی ہوا۔ سب پر وجد کی حالت طاری ہوگئی۔ ٹھیک یہی نظارہ آج بھی صوفیوں کے حلقہ میں دیکھا جاتا ہے۔ "ھوحق" کے نعروں کے علاوہ ان کے منہ سے بے ساختہ ایسے کلمات بھی نکلتے ہیں جن کو ضمیمہ "انجیل اعمال الرسل" میں "خدا کی بڑی بڑی باتیں" کہا گیا ہے۔ جب یہ حالت کسی پر وارد ہو تو تماشائی تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص "روح" سے معمور ہے۔ اگر یونانی فلسفہ اور ویدانت کچھ تصوف سے ملتا جلتا ہے تو جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ تعلیم اسلام کے خلاف ہے صرف مشابہت کی بنا پر اسے مردود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو دعوت اتحاد دی گئی کہ "تعالوا الی کلمة بیننا و بینکم "یعنی آؤ ہم دین کے اصل اصول پر جو ہم میں ایک ہی ہیں، متفق ہو جائیں۔ دین تو ایک ہی ہے البتہ اس کے فروع مذاہب مختلف ہیں اور یہ اختلاف بھی فطرتاً ناگزیر ہے۔ اگر یہ اختلاف دین فطرت کے مخالف نہ ہو تو کچھ قباحت بھی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ لفظ "صوفی" یونانی لفظ "سوفسٹ" (sophist) سے مشتق ہے۔ اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا قباحت ہے؟ اگر اسلام کے مخالف نہ ہو۔ یوں تو مسلمانوں میں بہت فرقے مختلف ناموں سے موسوم ہیں اور سب ہی اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہیں۔ اگر اس خاص جماعت کو لوگ صوفی کہنے لگیں تو کیا گناہ کیا۔

"ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

لیکن بات یہ نہیں ہے۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جو مسلمان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مستفیض ہوئے، "صحاب" کہلائے۔ اس کے بعد جو "صحابہ" کو دیکھنے والے تھے، "تابعین" سے موسوم ہوئے۔ ان کے بعد جو تابعین کو جانتے پہچانتے تھے، تبع تابعین کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس کے بعد کوئی نام نہ رہا۔ علماء، فقہا و واعظان و "زہاد" تھے۔ ان میں سے "زہاد" کا لباس "صوف" تھا۔ اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کمبل پوش تھے۔ اور یہ لوگ حتی الوسع ظاہر حالت بھی باتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم پسند کرتے تھے۔ ان ایام میں کچھ انہی پر موقوف نہ تھا، ہر ایک جماعت کا الگ الگ امتیازی لباس تھا۔ سیاسیات کی الجھنوں نے بھی لباس میں امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ علماء کا خاص وضع کا لباس تو تھا ہی، سادات نے سبز اور عباسیوں نے سیاہ رنگ منتخب کیا۔ یہ زمانہ کچھ ایسا پُر آشوب تھا کہ جو لوگ غالباً اس خیال سے کہ ''ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را'' عزلت نشین ہو گئے کہ سیاسی جھمیلوں سے الگ ہی رہیں۔ چونکہ یہ لوگ امن پسند مرنجاں مرنج تھے اور اس کے ساتھ ہی زاہد و عابد بھی تھے، خلوت گزیں ہو گئے۔ یہ لوگ صوف پوش تھے۔ قیمتی لباس دیبا و حریر ویسے بھی بعض احادیث کی رُو سے مردوں کے لیے ممنوع ہے۔ ان مفلسوں کو یہ امیرانہ لباس کہاں نصیب تھا۔ فقر و فاقہ ہی میں بسر کرتے تھے۔ اور امرا و وزرا کا کیا مذکور ہے، عوام کی صحبت سے بھی کنارہ کش رہتے۔ حضرت غوث الاعظم کا ایک مشہور قول ہے کہ ''صوفی لباس صوف سے نہیں بنتا بلکہ باطن صفا ہونا چاہیے۔'' علم الالسنہ کی رُو سے بھی ''صوفی'' کو یونانی لفظ ''سوفسٹ'' سے ملانا درست نہیں۔ جب یونانی فلسفہ کی اشاعت مسلمانوں میں ہوئی تو وہ اس لفظ سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ مولانا جامیؒ ''لوائح'' (بست و ششم) میں بحوالہ ''فصوص الحکم'' (فص شعیبی) لکھتے ہیں کہ ''عالم سے مراد وہ اعراض ہیں جو عین واحد میں مجتمع ہیں جو حقیقت ہستی ہے اور یہ عالم ہر آن بدلتا رہتا ہے اور ہر آن عدم میں جاتا ہے۔ البتہ اس کا مثل ہر آن ظہور میں آتا ہے۔ اکثر اہل علم اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ارشادِ قرآن ہے کہ ''بل ھم فی لبس من خلق جدید''۔ اور ارباب نظر میں سے کوئی اس معنی پر مطلع نہیں ہوا۔ اشاعرہ بعض اجزا عالم یعنی اعراض میں تجدد کے قائل ہیں۔ اور سوفسطائیہ تمام اجزا عالم میں خواہ یہ جواہر ہوں یا اعراض تجدد مانتے ہیں۔ حسبانیہ (pythagorean) اور سفسطہ (sophists) یونانی فلسفی ہیں، سب غلطی خوردہ ہیں۔

سوفسطائی کہ از خرد بے خرد است | گوید عالم خیالی اندر گزر است
آرے (۱) عالم ہمیں خیال است ولے | جاوید درد حقیقی جلوہ گر است

(۱): اس رباعی میں اشارہ افلاطون کے عالم مثال (ideas) کی طرف ہے۔ مناسب مقام پر بحث ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

مسئلہ تجدد امثال (dialectical changes) پر ہم مناسب مقام پر بحث کریں گے اس مقام پر صرف اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ حکما اسلام اصلی یونانی لفظ ''سوفسطا'' سے خوب واقف تھے اور ''حُسبانیہ'' سے بھی، اور ان کے عقائد کی تردید بھی کرتے۔ اس لیے صوفی اور تصوف کی اصل یونانی لفظ نہیں۔ ان کو ''حُسبانیہ'' اس واسطے کہا گیا ہے کہ یہ سب ریاضی دان تھے۔ سفسطہ کا منطقی اور لفظی صنعت پر فلسفہ ختم تھا لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ زاہد و عابد ہر ایک قوم میں رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ ان کا اور ان کی کٹیا اور معابد اور مندروں کا احترام واجب ہے۔ چنانچہ ارشاد قرآن ہے کہ:

''**ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض تھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیراً**'' (۱۷/۱۳) اگر اللہ (مفسدین کے جارحانہ حملوں کو) مدافعت کے ذریعہ رفع نہ کرتا تو درویشوں کے خلوت خانے اور نصاریٰ کے گرجے اور یہود کے معابد اور مسجدیں (آخرالذکر میں) اللہ کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے، ڈھائے جاتے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد سے پہلے یہود و نصاریٰ کے معابد بھی تھے اور تاریخی شہادت سے واضح ہوتا ہے کہ نصاریٰ کے معبد بھی تھے۔ (monastories) جہاں تارک الدنیا بھی تھے جو عموماً جنگلوں میں کٹیا بنا کر رہتے۔ ارشاد قرآن ہے:

''**و رھبانیۃ ابتدعو ھا ما کتبنٰھا علیھم، لاّابتغآ ۔ رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا۔**'' (۲۷/۲۰) اور رہبانیت دین میں شاخسانہ انہوں نے نکالا۔ ہم نے ان پر فرض تو صرف اللہ کی رضاجوئی ہی کی تھی۔ اس کی بھی رعایت جیسا کہ رعایت کا حق ملحوظ نہ رکھی۔

مدت العمر تجرد میں بسر کرنا خلاف منشا فطرت ہے۔ اس لیے آں حضرتؐ نے بھی فرمایا کہ ''**لا رھبانیۃ فی الاسلام**۔'' اسلام میں رہبانیت نہیں۔ یہود میں بھی یہ دستور تھا کہ اگر کوئی اسرائیلی عورت بانجھ ہوتی یا یقین کرتی کہ بانجھ ہے تو نذر مانتی کہ اگر خدا میرا رحم کھولے تو جو بچہ پیدا ہوگا، اسے خدا کی نذر کروں گی۔ اس کے متعلق توراۃ میں مفصل ہدایات ہیں۔ یہ ضرور نہ تھا کہ نذر شدہ بچہ تمام عمر مجرد رہے۔ کسی

خاص مدت کے لیے بھی ہوسکتا تھا۔ نذر کی مثال سموئیل نبی ہیں، جو تمام عمر مجرد رہے اور حضرت یحییٰ بھی ہیں اور عمران کی بیٹی مریم صدیقہ بھی ہیکل کی نذر کی گئی تھی مگر اس کا نکاح حسب نوشتہ انجیل یوسف نامی شخص سے ہوا جو حضرت داؤد کی اولاد سے تھا۔ دیگر قوموں میں بھی ایسے درویشوں کی کمی نہ تھی جو مجرد رہتے۔ اس میں ایک کشش آرام طلب بے کار لوگوں کے لیے تھی۔ چنانچہ ''گبن'' مورخ لکھتا ہے کہ ''تعجب ہے یہ لوگ نسل انسانی بڑھانے کے بغیر روز افزوں ترقی کر رہے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ترک دنیا سے دُنیا زیادہ بنتی ہے۔'' لوگ ان کو مقربانِ خدا سمجھتے اور یقین کرتے کہ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، اس لیے ہر ایک قماش کے غرض مند عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے بصد عقیدت ان کی توقیر کرتے اور زر و مال نذر کرتے۔ ارشادِ قرآن ہے کہ:

''یا ایها الذین امنو ان کثیراً من الاحبار والرهبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله '' (۱۱/۱۰) اے مسلمانوں اکثر مشائخ اور درویش لوگوں کا مال ناحق ڈھکوستے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔

ابتداء میں صوفیوں کی کوئی خانقاہ نہ تھی۔ پہلی خانقاہ ''رملہ'' واقع ملک شام میں تعمیر ہوئی۔ مولانا جامیؒ ''نفحات'' میں لکھتے ہیں کہ یہ بھی ایک عیسائی امیر آدمی نے تعمیر کروائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شام میں ''مانسٹریز'' بہت تھیں، جن میں رہبان عبادت کرتے۔ کسی صوفی کو یہ طریقہ پسند آیا اور اس نے بھی ایک خلوت خانہ بنا لیا۔ بہرحال اس کی ابتدا ملک شام سے ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے خود یا بعض عقیدت مندوں نے ہر جگہ خانقاہیں بنا دیں۔

شیخ فریدالدین عطارؒ نے ''تذکرۃ الاولیا'' میں اور مولانا جامیؒ نے ''نفحات الانس'' میں ان اولیاء اللہ کا تذکرہ اور ان کے اقوال لکھے ہیں اور یہ دونوں مستند کتابیں ہیں۔ شیخ عطار اور کتابوں مثلاً ''شرح القلب'' اور ''کشف الاسرار'' اور ''معرفۃ النفس والرب'' کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ ان کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کرام کا شغل زندگی زیادہ تر تزکیہ نفس و تصفیہ قلب اور ذکر الٰہی ہی ابتدا میں تھا۔ مناسب مقام پر اس موضوع پر بحث کی جائے گی۔ شیخ عطار اور مولانا جامیؒ نے جن بزرگوں کا تذکرہ لکھا

Marfat.com

ہے ان کو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اگر چہ یہ تقسیم بالکل ہمارے زمانہ کے محققین کے اسلوب بیان کے مطابق ہے اور سبق آموز بھی ہے، کہ اس کی ابتدائی صورت کیا تھی اور رفتہ رفتہ ارتقا کس طرح ہوا اور اس کے اسباب کیا ہیں اور انحطاط کب اور کس طرح شروع ہوا اور اب اس کی کیا حالت ہے۔ لیکن اس مختصر کتاب میں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لیکن فہم و تفہیم کے لیے ہم مختصر بحث کریں گے۔

طبقہ اولیٰ میں جو بزرگ گزرے ہیں۔ وہ تابعین اور تبع تابعین تھے۔ ان میں سے کسی کو ''صوفی'' نہیں کہا گیا۔ مولانا جامیؒ ''نفحات'' میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا، وہ ابو ہاشم ''الصوفی'' تھا۔ اصل میں ''کوفی'' تھا۔ مگر شام میں رہائش اختیار کی۔ سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ کا ہم صحبت بصرہ میں ۱۶۱ھ میں رہا۔ خود سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ اگر ابو ہاشم نہ ہوتا تو میں ''ریا'' کے دقایق سے واقف نہ ہوتا۔ ابو ہاشم سے پہلے بھی بزرگ گزرے ہیں کہ تقویٰ اور زہد و ریاضت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ لیکن ابو ہاشم سے پہلے کسی کو صوفی کے نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ ان بزرگوں کے تقویٰ کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ ایک روز قاضی ''شریک'' کو یحییٰ بن خالد برمکی وزیر کے محل سے برآمد ہوتے دیکھ کر آبدیدہ ہو کر کہا کہ ''**اعوذ باللہ من العلم لا ینفع**'' خدا کی پناہ ایسے علم سے جو نفع نہ دے۔

شیخ عطارؒ اور دوسرے تذکرہ نویس اولیاء اللہ کے حالات حسن بصریؒ سے شروع کرتے ہیں۔ آپ تابعین میں سے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک سوتیس (۱۳۰) صحابہ سے ملے جن میں ستر (۷۰) بدری تھے۔ حضرت حسن ابن علیؓ سے خاص ارادت تھی۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں بصرہ میں موجود تھے۔ ان روایات میں شاید مبالغہ بھی ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ آپ ان حضرات کی صحبت سے فیض یافتہ تھے۔ رابعہ بصری جس کا زہد و تقویٰ ضرب المثل ہے اکثر آپ کی مجلس وعظ میں شامل ہوتیں۔ ایک روز کسی نے آپ کو کہا کہ ''فلاں شخص تیری غیبت کرتا تھا۔'' ایک تھال کھجور اس شخص کے پاس بھیج کر لکھا کہ ''میں نے سنا ہے کہ تو نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں لکھ دی ہیں۔ اگر چہ یہ شکرانہ حقیر ہے مگر چہ کند بے نوا ہمیں دارد۔'' ۔ یہ اشارہ اس حدیث شریف کی طرف ہے کہ ''جو شخص کسی مومن مسلمان کی غیبت کرتا ہے اپنی نیکیاں اس کے نامۂ

Marfat.com

اعمال میں لکھتا ہے۔'' ان حضرات کے اخلاق ستودہ کا کیا مذکور ہے۔ دوسروں کی اصلاح نفس کس لطیف پیرایہ میں عملاً کرتے رہے۔

زمانہ اپنی ضرورت کو خوب جانتا پہچانتا ہے۔ ہر ایک اصلاحی تحریک زمانہ ہی کی ضرورت کے مقتضی ہوتی ہے اور ذہنی ارتقا اسی سے وابستہ ہے۔ امام قشیریؒ لکھتے ہیں کہ ہجرت نبوی کو دو سو سال بھی نہ گزرے تھے کہ تبع تابعین کے بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر ایک فریق یہی کہتا کہ وہی اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتا ہے۔ صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں اتباع سنت کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہ قریب تر زمانہ نبوت تھا اور نبوت کا ادب بھی تازہ تھا۔ لیکن جب مسلمان ایک دنیا پر چھا رہے تھے اور مال و دولت سے ان کے گھر بھر گئے تو دور تعیش بھی شروع ہو گیا۔ اور خانہ جنگی کا آغاز تو خلافت دوم کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ دوسری صدی میں اموی اور فاطمی اور عباسی دعوے دارانِ سلطنت ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو رہے تھے۔ غرض یہ ایام دنیا اسلام پر ذہنی پریشانی کا موجب ان حضرات کے لیے تھے، جو بعد میں صوفی کہلائے۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اس طوفان بے تمیزی میں گوشۂ عزلت اختیار کرتے اور کسی سیاسی یا مذہبی فریق کی ہنگامہ آرائی سے الگ تھلگ ہی رہتے اور اس لیے بھی کہ ان کی عبادت میں خلل اندازی نہ ہو۔ حضرت جنیدؒ کی ہمسائیگی میں ایک یہودی آ رہا۔ حضرت جنیدؒ تورات کی تنہائی میں مشغول بحق ہو جاتے اور پڑوسی ''ہمسایہ بدمباش کس را،'' راگ رنگ اور شراب و ناؤ نوش میں ہڑبونگ مچایا کرتا۔ کچھ عرصہ تو آپ نے صبر کیا کہ شاید چند روز کے بعد یہ بلا ٹل جائے گی مگر جب دیکھا کہ وہ ہر شب عادتاً ہی ایسا کرتا ہے تو رہ نہ سکے اور صبح کے وقت نرمی اور لطف سے شکایت کی اور درخواست کی کہ میرے اوقات میں خلل نہ ڈالو۔ یہودی نے کہا کہ ایک کام آپ اپنے گھر میں کرتے ہیں اور میں بھی ایک کام حسب معمول اپنے ہی گھر میں کرتا ہوں، دن بھر کی فکر معاش کے بعد تفریح نہ ہو تو زندگی تلخ ہو جائے۔ آپ نے کہا کہ تفریح سے میں منع نہیں کرتا یہ جو یار دوست تمہارے ہاں جمع ہوتے ہیں، اور تمام رات کا اکثر حصہ اودھم مچاتے ہو، سمجھ سکتے ہو کہ مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ یہودی نے کہا کہ تمہیں تو اور کچھ کام وعظ و شب بیداری کے سوا ہے ہی نہیں۔ کیا مجھے بھی درس

وعظ دینے آئے ہو۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ اگر تم نہیں مانتے تو شکایت خلیفہ سے کروں گا۔ یہودی نے کہا کہ ضرور کریں اور آج ہی کریں۔ وہ بھلا مجھے کیا کہہ سکتا ہے جب وہ رات دن خود رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ سچ کہتے ہو، اچھا اب میں خدا کے حضور شکایت کروں گا۔ یہودی نے کہا کہ اس کی درگاہ میں آپ کا زہد وتقویٰ اور میری مے خواری برابر ہے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ اچھا بابا مجھے معاف کرو اور جو بھی دل میں آئے، کرو۔ آئندہ میں خاموش رہوں گا۔ یہودی پاؤں پر گرا اور کہا کہ اے شیخ مجھے للہ معاف کرو۔ آئندہ مجھ سے ایسی ناشائستہ حرکت سرزد نہ ہوگی جس کی وجہ سے آپ کو شکایت ہو۔ یہ یہودی لوگوں کے پاس حضرت جنیدؒ کے اوصاف حسنہ اکثر بیان کرتا۔ ایک دفعہ کسی نے کہا کہ جنید تو مسلمان ہے، جب تجھ پر اسلام کی خوبی واضح ہو چکی ہے تو کیوں مسلمان نہیں ہوتا۔ جواب دیا کہ جنید کی مثل میں مسلمان نہیں ہوسکتا اور تمہاری طرح ہونا نہیں چاہتا۔ ایسے ایسے واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اکابر کی کیا حالت تھی۔ اور جب بڑے بگڑے تو چھوٹے خود بخود بگڑ جاتے ہیں۔ طایفہ صوفیہ ان ایام میں اپنا فرض تبلیغ ادا کرتا رہا۔ یہ وہ اہم فرض تھا جسے مسلمان ایک عرصہ سے فراموش کر چکے تھے۔ اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو ایک دفعہ عامل مصر نے لکھا کہ مصر میں لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ''جزیہ'' سے بچنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں ان کا امتحان ''ختنہ'' سے کروں۔ خلفیہ نے تہدید آمیز خط میں لکھا کہ کم بخت اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصولی ''جزیہ'' اور لوگوں کو مختون بنانے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا۔ اگر تو نے کوئی ایسی ناشائستہ حرکت کی تو ایک غلام تیرے حواس خمسہ درست کرنے کے لیے بھیج دوں گا۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ اموی خلافت نے اپنا فرض منصبی عربی زبان اور اسلام کی اشاعت ہی سمجھا ہوا تھا۔ چنانچہ جہاں کہیں یہ گئے عربی زبان اور اسلام کی اشاعت خاطر خواہ ہوئی۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ افغانستان اور بلوچستان اور سندھ اور ترکستان اور ایران میں خالص مسلم آبادی اموی خلافت کی سعی کی مشکور ہے۔ لیکن ایک صدی کے بعد اموی سلطنت کا تختہ ایشیا میں عباسیوں نے الٹ دیا اور اشاعت اسلام رک گئی۔ اس وقت اس اہم فرض کی ادائیگی کا احساس اسی طائفہ صوفیہ

Marfat.com

کو ہوا۔ اس وقت یہ کوئی منظم جماعت نہ تھی۔ ان کی انفرادی کوشش ہی بار آور ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ان کے تبلیغی مرکز قائم ہو گئے تو انہیں بہت کامیابی ہوئی۔ تاریخ میں چودہ (۱۴) ایسے مرکزوں کا مذکور عموماً کیا جاتا ہے جن کی شاخیں مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ اور نقشبندیہ ہمارے ہندوستان میں بہت مشہور ہیں۔ چشتیہ کو نمایاں کامیابی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ ان کے مجلس وعظ میں راگ کی بھی آمیزش تھی۔ چشتیہ خاندان کے بزرگوں میں سے جو ہندوستانِ میں آئے خواجہ معین الدین حسن سنجری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ سے پیشتر پنجاب غزنوی حکومت کے تصرف میں آ چکا تھا، جس کا جانشین غوری خاندان ہوا۔ لاہور میں حضرت علی ہجویری سلطان محمود کے پوتے کے زمانہ میں آئے اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس سے آگے فقراء نہ بڑھے اور ان کی تبلیغی سرگرمیاں اسی ملک میں محدود رہیں۔ خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے اجمیر کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی اوشی ہوئے، جن کی سکونت دہلی میں رہی۔ اس وقت ہندوستان پر خاندانِ غلاماں متصرف ہو چکا تھا۔ قطب صاحب نے اپنے دوست قاضی حمید الدین ناگوری سے ''مسئلہ سماع'' کا جواز بذریعہ تحریر دریافت کیا کہ ''مجلس وعظ میں عوام کی شرکت بہت کم ہوتی ہے اور تبلیغ کے مقصد کی تکمیل بھی نہیں ہوتی۔ ہندوستانی راگ کے شائقین ہیں۔ اگر اس کی اجازت شرعاً ہے تو یہ لوگ مجلس وعظ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ قاضی صاحب نے جواب میں لکھا کہ ''مزامیر'' کا استعمال تو ممنوع ہے البتہ خوش الحانی کے ساتھ ایسی غزلیں یا نظمیں جو حمد و نعت یا اخلاقی مضامین پر لکھی گئی ہوں، پڑھنا جائز ہے۔

''سماع'' کا مسئلہ قطب صاحب سے پیشتر بھی موضوع بحث تھا۔ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اُن کے لیے جو اِس کے اہل ہیں، یعنی محض لہو و لعب کے لیے نہیں، بلکہ جذبات محبت ابھارنے کے لیے جو درویشوں کو خدا سے ہے۔ امیر خسرو طوطی ہند، حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔ خود ذہانت مجسم تھے اس لیے نہ صرف چند راگنیاں ایمن وغیرہ بنائیں بلکہ ستار بھی ایجاد کی اور صوفیہ کرام کے لیے ''قول'' بھی اختراع کیا، جس کو آج کل ''قوالی'' کہتے ہیں۔

Marfat.com

چشتیہ بزرگوں کا یہ دستور تھا کہ اپنے خلفا کو یا ان طالبان حق کو، جو فارغ التحصیل ہو جاتے، مختلف مقامات کی طرف بغرض تبلیغ روانہ کرتے رہتے۔ چنانچہ خواجہ اجمیریؒ نے قطب الدینؒ کو دہلی میں مقرر کیا اور قطب صاحب نے اپنے خلیفہ فریدالدین المعروف گنج شکر کو ''اجودھن'' میں، جو اَب ''پاک پتن'' کے نام سے مشہور ہے اور گنج شکر نے محبوب الٰہی نظام الدین اولیا کو دہلی میں، قطب جمال کو ہانسی میں، اپنے بھانجے علی احمد صابر کو کلیر میں بھیجا۔ محبوب الٰہی کے بعد خرقہ درویشی نصیرالدین چراغ دہلی کو ملا تو اپنے خلیفہ سید محمد گیسو دراز کو دکن کی طرف روانہ کیا، جہاں آپ کا مزار زیارت گاہِ عام ہے۔ فرشتہ آپ کی نسبت لکھتا ہے کہ لوگوں کی عقیدت کا یہ حال ہے کہ اگر کسی دکنی سے دریافت کرو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ زیادہ ہے یا سید محمد کا۔ تو یہی جواب دے گا کہ آں حضرت تو نبی اور رسول ہیں ''مگر سید محمد چیزے دیگر استَ۔''

عام دستور یہ تھا کہ پہلے علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرنے پر کسی پیر طریقت کی تلاش ہوتی۔ مراتب سلوک طے کرنے کے بعد ان کو سند ارشاد ملتی۔ ان میں سے اکثر ادیب بلند پایہ بھی گزرے ہیں۔ مولانا رومی، نظامی، حکیم سنائی، شیخ عطار اور شیخ سعدی اور حافظ شیرازی اور مولانا نورالدین، عبدالرحمٰن جامی، اور امیر خسرو اور بیدل وغیرہم کے کلام سے آج اکثر واقف ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ فارسی شاعری کو چاشنی تصوف ہی نے دی۔

ابتدا میں جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، اہل اللہ کی عملی زندگی ہی علمی زندگی تھی۔ اور ان کی توجہ تحریر کی طرف بالکل نہ تھی۔ وہ ہمہ وقت تہذیب نفس اور حسن معاملات میں مشغول رہتے۔ تابعین اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والے تھے اور متابعت سنت انھی کے عمل سے کرتے۔ ان کے لیے تعلیم و تعلم کی ضرورت نہ تھی۔ تبع تابعین میں تحریر کا رواج شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب حکما اسلام کی توجہ یونانی علوم اور فلسفہ کی طرف ہوئی تو علوم (sciences) میں تو ان کو کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ لیکن فلسفہ کو عقائد کے حق میں مضر خیال کیا۔ ہسپانیہ میں اموی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی آبائی روایات دَر بارہ تبلیغ رفتہ رفتہ فراموش کر چکے تھے مگر عربی کی

ترویج میں کوشش برابر جاری رہی۔ یونانی علوم اور فلسفہ کو از سر نو زندہ کیا۔ عربی میں ترجمے ہوئے۔ یورپ کے مختلف ممالک سے طالبان علم آتے اور فارغ التحصیل ہو کر جاتے اور اپنے ہم وطنوں میں عربی مصنّفین کی کتابیں پڑھاتے۔ چنانچہ ''ڈریپر'' اپنی کتاب یورپ کا ذہنی ارتقا(intellectual development of Europe) میں لکھتا ہے کہ یورپ کی زبانوں پر تا حال عربی زبان اور اس کی اصطلاحات علمیہ کا قبضہ ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن العربی جو قائلین وحدت الوجود کے امام سمجھے جاتے ہیں اسی ملک ہسپانیہ کے شہر ''مریسہ'' میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بعد ازاں دمشق میں اقامت اختیار کی اور ''فصوص الحکم'' اسی جگہ لکھی۔ اس وقت تک تصوف علمی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس کی اصطلاحات مدوّن ہو چکی تھیں۔ مولانا روم نے بھی شیخ اکبر کا زمانہ پایا ہے۔ اس وقت مولانا کا لڑکپن تھا۔ لیکن شیخ اکبر کے خلیفہ صدرالدین قونوی سے مراسم دوستانہ گہرے رہے اور غالباً مسئلہ ''تجدد امثال'' (dialectical changes) مولانا نے شیخ صدرالدین ہی سے سیکھا۔ اگرچہ تصوف اب ایک مستقل علم بن گیا تھا، مگر صوفی محض فلسفیوں کی طرح باتونی نہ تھے۔ وہ بدستور تہذیب نفس میں مشغول رہے اور ان کی بے لوث زندگی ہی کا اثر تھا کہ لوگ ان کا احترام کرتے اور ان کو اولیا اللہ کے نام سے یاد کرتے۔ ان سے بہت کرامات منسوب ہیں۔ لیکن سردست یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے۔ مناسب مقام پر ضروری امور واضح کیے جائیں گے۔

بغداد میں مدرسہ نظامیہ نظام الملک طوسی وزیر ملک شاہ سلجوق نے تعمیر کرایا تھا۔ نظام الملک کو شیخ ابواسحاق شامی سے انتہائی ارادت تھی۔ اس لیے شیخ کو اس مدرسہ کا مدرس اعلیٰ مقرر کیا۔ مگر کسی نے شیخ کو کہہ دیا کہ اس مدرسہ کی عمارت لوگوں کے خون سے بنی ہے۔ اس لیے مدرسہ میں قدم نہ رکھا۔ مگر نظام الملک کی التجا پر مدرسہ کے قریب ہی ایک مسجد تھی، وہاں بیٹھ کر طالب علموں کو درس دیا کرتے۔ شیخ سعدی بھی اسی مدرسہ کے وظیفہ خوار طالب علم تھے اور اس وقت مدرس امام ابوالفرج جوزیؒ تھے جو دنیا اسلام میں مشہور شخصیت ہے۔ شیخ سعدیؒ کے پیر طریقت شیخ شہاب الدین سہروردی تھے، جن کے مرید شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی بھی ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی

Marfat.com

کتاب ''عوارف المعارف'' ہمیشہ طالبان حق کے زیر مطالعہ رہی ہے۔ اسی مدرسہ کے مدرس امام محمد غزالی تھے۔ امام صاحب صاحبِ تصنیف کثیر ہیں۔ ''احیا العلوم الدین'' آپ کی مشہور کتاب ہے۔ جس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ آپ نے اپنے حالات خود بیان کیے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جو کچھ متقدمین بالخصوص حکماء نے لکھا ہے، وہی طالب علموں کو پڑھاتا ہوں اور کبھی یہ خیال نہ آیا کہ جو کچھ درس دے رہا ہوں وہ صحیح بھی ہے کہ نہیں۔ علم کا ذریعہ حواس و عقل ہیں۔ حواس جو کچھ دکھاتے ہیں، عقل اس کی تردید کرتی ہے۔ جو اس سورج کو ایک چھوٹا سا کرہ دکھاتے ہیں عقل اس کا بہت بڑا کرۂ نار بتاتی ہے۔ نصف زندگی انسانی خواب میں گزرتی ہے جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں، اس وقت عقل اس کی تکذیب نہیں کرتی، بیداری میں جھٹلاتی ہے۔ کیا ان کے علاوہ کوئی اور ذریعہ دریافت ''حق'' ہے؟ امام صاحب کہتے ہیں کہ یونانی فلسفہ وغیرہ کا مطالعہ بہ نظر غائر تو کر چکا تھا، ان پر جو اعتماد تھا اٹھ گیا۔ صوفیہ کرام کا دعویٰ تھا کہ عقل وحواس کے علاوہ ایک اور ذریعہ بھی ہے اور ایسا ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ، کوئی الجھن نہیں۔ حقانیت بالبداہت ثابت شدہ امر اسی ذریعہ سے ممکن ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ امام صاحب نے کتب تصوف کا مطالعہ شروع کیا۔ جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوسکتا تھا، وہ تو معلوم ہو گیا مگر کتابیں کسی اور طرف راہنمائی کر رہی تھیں۔

صد کتاب وصد ورق در نار کن　　　خفتہ دل را یک دمے بیدار کن

مولانا جامیؒ لوائح (بست وششم) میں لکھتے ہیں کہ:

تحقیق معانی از عبارات مجو　　　بے رفع قیود و اعتبارات مجو
خواہی یابی زعلت جہل شفا　　　قانون نجات از اشارات مجو

نیز

گشتی بوقوف بر وقف قانع　　　شد قصد مقاصدت زمقصد مانع
ہرگز نشود تا نہ کنی رفع حجب　　　انوارِ حقیقت از مطالع طالع

اب جب کہ یہ حقیقت منکشف ہوگئی تو امام صاحب کے دل میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ آپ کے علم وفضل کا شہرہ تھا۔ بیش قرار ماہانہ کے علاوہ عام و خاص تو کیا خلیفہ وقت بھی احترام سے پیش آتا۔ یہ سب کچھ عزت و جاہ و مال چھوڑ کر "علم حق" کی تلاش ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ میں انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ میری زبان خود بخود بند ہوگئی۔ یہ کشمکش کچھ وقت جاری رہی آخر مدرسہ نظامیہ کو خیر باد کہا اور حج کے ارادہ سے بغداد سے نکل آئے۔ یہ واقعہ ۴۸۴ھ کا ہے۔ حج کے بعد شام میں گئے اور کچھ مدت بیت المقدس میں معتکف رہے۔ پھر مصر میں گئے اور یہاں سے واپس دمشق میں آئے اور جامعہ دمشق میں دس سال معتکف رہے۔ آپ کا انتساب تصوف میں شیخ علی فارمدیؒ سے ہے اور شیخ علی شیخ ابوالقاسم گرگانی کے مرید ہیں۔ شیخ علی کو حضرت ابوالحسن خرقانی سے بھی نسبت حاصل ہے اور حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر قدس سرہ کی صحبت میں بھی رہے۔ ان میں سے ہر ایک علم تصوف کے امام تسلیم کیے گئے ہیں۔ اس لیے قیاس ہوسکتا ہے کہ امام غزالی کو فیض کس نسبت سے ملا۔ امام صاحب نے نیشاپور میں امامت اختیار کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ علماء نیشاپور نے طوفان مخالفت برپا کر دیا۔ اور وہی الزام عائد کیا جو سقراط پر لگایا گیا تھا کہ یہ شخص نوجوانوں کے عقائد خراب کرتا ہے۔ امام صاحب خاموش رہے اور کسی یاوہ گو کی تقریر و تحریر کا جواب نہ دیا۔ علماء کا ایک وفد حاکم نیشاپور کی خدمت میں حاضر ہوا اور زور دیا کہ اس فتنہ الحاد کا سدباب واجب ہے۔ طلبی ہوئی تو چار و ناچار "اولی الامر" کی اطاعت کے خیال سے حاضر ہوئے۔ علماء بھی موجود تھے۔ حاکم نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ علماء موجود ہیں اور تیرے عقائد کو الحاد قرار دیتے ہیں۔ تیرا کیا جواب ہے۔ امامؒ نے کہا کہ سبحان اللہ میری تمام عمر تحصیل علم میں گزری۔

درد ہر یکے چو من او ہم کافر　　پس در دہر کسے مسلمان نبود

اس کے بعد اپنی سرگزشت سنائی اور کہا کہ جب میں دمشق سے نکلا تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے روضۂ مبارکہ پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا اور عہد کیا کہ کبھی امراو وزراء کے درِ دولت کی طرف رخ نہ کروں گا اور نہ کبھی کسی سے بحث و مباحثہ

Marfat.com

کروں گا اور یہ کہ بقیہ عمر نشر علم دین میں بسر کروں گا اور اس کے لیے فقر و فاقہ قبول کروں گا۔ دو عہد تو تیری وجہ سے ٹوٹے۔ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے اس لیے حاضر ہونا ہی پڑا۔ اب یہ علماء کرام موجود ہیں اور مجھ سے بحث و مباحثہ کے خواست گار ہیں۔ اگر میں نے عہد نہ کیا ہوتا تو میں ان کی تشفی بہت عرصہ پہلے کر دیتا۔ حاکم پر آپ کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ عزت و احترام سے رخصت کیا۔ علماء بھی مبہوت ہو کر رہ گئے اور بحث و مباحثہ کی نوبت نہ آئی۔

''رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت''

اس ایک واقعہ کو ہم نے مثالاً بیان کیا ہے تبع تابعین کے آخری دور تک اہل شریعت سے صوفیوں کا تصادم نہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا زمانہ عہد نبوت کا اقرب تھا۔ اور یہ حضرات سختی سے نہ صرف فرائض کے پابند تھے، بلکہ وہ نوافل بھی جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب تھے اور اب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موسوم ہوئے، بجا لاتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے خاص شغف تھا جو آخر وقت تک قائم رہا۔ جو بھی فرصت کا وقت ملتا، عبادت میں گزار دیتے۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک جماعت نے متابعت کی۔ ارشادِ قرآن ہے کہ:

''ان ربک یعلم انک تقوم ادنی من ثلثی الیل و نصفہ ط وثلثہ وطائفۃ من الذین معک ط واللہ یقدر الیل والنھار ط علم ان لّن تحصوہ فتاب علیکم فاقرءُوا ماتیسّر من القراٰن ط علم ان سیکون منکم مرضٰی واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ واٰخرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقرءُوا ما تیسّر منہ۔''

اللہ جانتا ہے کہ تُو رات کے وقت (عبادت کے لیے) قریب دو تہائی اور آدھی یا تہائی (مختلف اوقات میں) کھڑا رہتا ہے اور ایک جماعت تیرے اصحاب میں سے بھی تیری متابعت کر رہی ہے اور اللہ نے تو دن رات (کے مشاغل) کا اندازہ مقرر فرما دیا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اسے نباہ نہ سکو گے، تو تم پر شفقت فرماتا ہے (کہ تکلیف نہ ہو) تو قرآن سے جتنا بھی سہولت سے پڑھ سکتے ہو، پڑھو۔ اللہ جانتا ہے

Marfat.com

کہ تم میں سے بیمار بھی ہوں گے اور ایسے بھی ہیں جو بغرض تجارت سفر کی مشقت برداشت کریں گے اور ایسے بھی ہیں جو اللہ کی راہ میں لڑیں گے۔ تو جتنا بھی قرآن سے بسہولت ہو سکے، پڑھو۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ:

"واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسنا ط وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ھو خیراً واعظم اجراً واستغفروا اللہ ط ان اللہ غفور الرحیم" اور نماز قائم رکھو، اور زکوٰۃ دو اور اللہ (کے راستہ میں) قرض حسنہ دو اور جو کچھ بھی تم اپنے لیے بھلائی بغرض ثواب آخرت کرو گے تو وہ اللہ کے پاس بہتر پاؤ گے اور اس کا اجر بڑا ہی ہے۔ اور اللہ سے بخشش مانگو۔ تحقیق اللہ بخشنے والا رحیم ہے۔ (۱۴/۲۹)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ:

"اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق الیل وقراٰن الفجر، ان قراٰن الفجر کان مشھوداً ٥ ومن الیل فتھجد بہ نافلۃً لّک عسیٰ ان یبعثک ربّک مقاماً محمودًا" (۱۵/۹)

"صلوٰۃ قائم کر سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن فجر (پڑھ) تحقیق علی الصبح قرآن کا پڑھنا دل پر خوب اثر کرتا ہے اور دل نشین ہوتا ہے۔ اور رات (کسی وقت) قرآن کے ساتھ تہجد بھی ادا کر جو تیرے لیے نفل ہے۔ تیرا پروردگار تجھے جلدی ہی مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔"

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دن اور رات کے مشاغل مقررہ ہیں، چنانچہ ارشاد قرآن ہے کہ:

"وجعلنا نومکم سباتاً ٥ وجعلنا الیل لباساً ٥ و جعلنا النھار معاشاً ٥" اور تمہارے لیے نیند آرام کا سبب اور رات پردہ (privacy) اور دن وقت معاش مقرر کر دیا" (۳۰/۱)

چونکہ الصلوٰۃ پر ہم نے علیحدہ بحث کی ہے، اس مقام پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ اس میں تمام عبادات داخل ہیں اور زکوٰۃ میں

Marfat.com

سب معاملات باخلق خدا۔ تابعین اور تبع تابعین نے ان نوافل کے علاوہ اور بھی نوافل اضافہ کیے۔ ''نفل'' کے معنی ہیں وہ جو فرائض پر زیادہ کیے جائیں، اس لیے کہ نیکی نیکی ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ لیکن بعض صوفیہ محققین ایسے بھی تھے جو اسے غلو فی الدین سمجھتے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر رات دن کے اوقات عبادت ہی میں صرف ہوں تو عبادت رہبانیت کی صورت اختیار کر لے گی۔ لیکن صوفیہ کرام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے کبھی عبادت کو اس مذموم حد تک نہیں پہنچایا۔

برصوم وصلوٰۃ برمی فزا چیزے تعدیل بہر امر کمال عرفاست

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جس کو ''اصحاب صفہ'' کہتے۔ ان کی پرورش بیت المال سے ہوتی۔ ان کو علم دین سکھایا جاتا اور انہی میں سے وہ لوگ بھی منتخب ہوتے جو عرب کے طول وعرض میں تبلیغ کے لیے جاتے۔ ان کے ذمہ اور بھی خدمات تھیں۔ عاملین زکوٰۃ وصدقات بھی انہیں سے مقرر کیے جاتے اور بعض ایسے بھی اہل علم تھے جن کو عامل کسی مقام کا مقرر کیا جاتا۔ ان میں سے ایک حضرت عامل مکہ تھے جن کا تذکرہ ابن اثیر نے ''اسد الغابہ فی فرصتہ الصحابہ'' میں لکھا ہے۔ آپ کا روزانہ وظیفہ آٹھ آنہ یومیہ تھا۔ فرماتے کہ جس شخص کا پیٹ آٹھ آنہ یومیہ سے نہ بھرے، دوزخ کی آگ سے بھرے گا۔ خلافت اول و دوم میں بھی عامل رہے اور ان کے ذمہ ایک پائی قرض کسی کا نہ تھا۔ ان لوگوں کے تقویٰ کا کیا مذکور ہے۔ اپنی آپ ہی نظیر تھے اور اکثر ایک ہی رنگ میں رنگین تھے۔

تبع تابعین کے بعد جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، صوفیہ کرام کا زیادہ تر شغل یہی رہا کہ اول علوم متداولہ میں کمال حاصل کرتے اور اس غرض کے لیے جہاں کسی اہل علم وحکمت کا نام سنتے، پہنچتے۔ تحصیل علم کے بعد تزکیہ نفس وتصفیہ قلب کی طرف متوجہ ہوتے۔ مثل مشہور ہے کہ ''صوفی جاہل مسخرہ شیطان''۔

شیخ سعدی بھی کہتے ہیں کہ:

خیالات ناداں گوشہ نشین! بہم برزند عاقبت کفر و دیں

Marfat.com

چونکہ یہ حضرات سب محققین تھے اور وہ باتیں بھی کہتے جو رسم پرست علماء ظاہر کو ناگوار گزرتیں اور اس لیے بھی خلائق کا رجوع زیادہ تر انہی کی طرف تھا۔ تحت الشعور میں حسد بھی کارفرما تھا اور اسی حقیقت کی طرف قرآن میں بھی اشارہ ہے کہ:

"وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ماجاء تھم البینٰت بغیاً اور (اصل دین میں) اختلاف انہی لوگوں نے کیا اور لڑتے میں جن کو آیات بینات دی گئیں اس کے بعد باہمی سرکشی سے اختلاف میں پھِر گئے۔ (۲/۱۰)

"وما اختلف الذین اوتوا لکتٰب الاّ من بعد ما جاء ھم العلم بغیاً بینھم" اور جن کو کتاب (توراۃ وانجیل وصحف انبیاء) دی گئی انہوں نے علم کے ہوتے باہمی سرکشی سے اختلاف کیا۔ (۳/۱۰)

صوفیہ اور علماء ظاہر میں فرق اتنا ہی تھا کہ علماء ظاہر تو ظاہری صورت (formality) کے سختی سے پابند تھے اور عامتہ المسلمین کو بھی اسی پابندی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاں تک ارکان اسلام کا تعلق ہے یہ کسی حد تک مناسب بھی تھا مگر فقہا نے ان میں وہ وہ موشگافیاں کیں کہ عوام کے لیے اس کی پابندی مشکل ہوگئی۔ اگر ایک وضو کے مسئلہ کو لیا جائے تو اس کے فرائض اور سنت اور مستحب اور واجبات کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو غالباً وضو صحت کے ساتھ ادا کرنا کافی دقت اور وقت کا مطالبہ کرتا ہے۔ مجھے خود ایک دفعہ ایسا ہی اتفاق نا ملائم پیش آیا کہ میں ایک صبح مسجد میں ایسے وقت میں پہنچا کہ نماز باجماعت ہو چکی تھی مگر ابھی وقت باقی تھا۔ بدقسمتی سے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تسبیح میں مشغول تھے۔ میں نے نماز ادا کی اور چلنے ہی کو تھا کہ روک لیا اور کہا کہ صاحب زادہ معلوم ہوتا ہے تم انگریزی خوان ہو۔ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں، امتحان بی اے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ رات کا کچھ حصہ بھی مطالعہ میں گزرتا ہے۔ اگرچہ نماز باجماعت اکثر مل جاتی ہے مگر کبھی قضا بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ مجھے اسی واسطے روکا گیا ہے کہ کس لیے جماعت قضا کی۔ فرمایا "نہیں، میں نے دیکھا کہ اول تو نے جلدی میں وضو کی تمام شرائط ادا نہیں کیں، دوسرے تمہارے شلوار اتنی نیچے ہے کہ ٹخنوں سے گزر کر پاؤں پر گرتی ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھتا جس کا ازار ٹخنوں سے نیچا ہو۔" مجھے یہ حدیث

معلوم تھی اور صحیح حدیث ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے سن کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا ازار خود بخود ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور ٹخنوں کے نیچے آ رہتا ہے۔" فرمایا کہ "یہ تمہارے لیے نہیں ہے ان کے لیے جو اس کو امارت کی نشانی سمجھتے ہیں اور فخریہ چلتے ہیں تو ان کا تہ بند زمین پر گھسٹتا جاتا ہے۔"

مگر میں نے بحث مناسب نہ سمجھی اس لیے کہ یہ حضرت حدیث کا ایک ٹکڑا بیان کرنے کے بعد انگریزی خوانوں پر برس پڑے اور وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ میں نے مناسب سمجھا کہ خاموشی سے سنوں۔ سلام کیا اور تیزی سے مسجد کے باہر آ گیا۔ یہ تو خیر صلوٰۃ اور وضو کی بات ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں مسائل میں۔ فتاویٰ عالمگیری پڑھ کر دیکھ لیں کہ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ایسے خیالی مسائل کی گتھی بھی حل کی جائے جو غالباً کسی شخص کو مدت العمر بھی پیش نہ آئیں۔ اور اگر کوئی مسلمان چاہے کہ میں ان مسائل پر عمل کروں جو روزمرہ حالات میں پیش آتے رہتے ہیں اور جن کی تدوین اس فتاویٰ میں کی گئی ہے تو شاید ایک بات بھی کما حقہ ادا نہ کر سکے۔ یہ وہ بات تھی جس کے خلاف صوفیہ محققین تھے۔ اس لیے ان میں تصادم ناگزیر امر تھا۔ ابتدا میں تو یہ حضرات علانیہ حقائق دین بیان نہ کرتے۔ جب کسی شاگرد کو اپنے حلقہ ارادت میں ہونہار دیکھتے تو اسے بتا دیتے مگر ساتھ ہی یہ تلقین بھی کرتے کہ خیر اسی میں ہے کہ راز فاش نہ ہو۔

"پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند"

مگر یہ پردہ پوشی زیادہ عرصہ تک نبھ نہ سکی۔

صوفیہ محققین کہتے کہ یہ رسمیں جن میں علماء ظاہر نے لوگوں کو جکڑ رکھا ہے، وہی ہیں اور اسی طرح اختراع کی جاتی ہیں جس طرح علماء یہود و نصاریٰ کا شیوہ تھا، چنانچہ ارشاد قرآن ہے کہ:

"الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوارتہ والانجیل یامرھم بالمعروف وینھم عن المنکر ویحل لھم الطیبٰت و یحرم علیھم الخبیث ویضع عنھم اصرھم والاغلٰل التی کانت علیھم " (9/9) وہ (اہل کتاب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں) جو اس رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جس کا مذکور لکھا ہوا توراۃ اور انجیل میں پاتے ہیں

Marfat.com

جوان کو معقول باتوں کا امر کرتا ہے اور نا معقول باتوں سے منع کرتا ہے اور تمام پاکیزہ رزق ان کے لیے حلال اور ناپاک حرام ٹھہراتا ہے اور ان (رسموں) کے بوجھ سے ان کو سبک دوش کرتا ہے جس میں وہ جکڑے ہوئے تھے اور وہ طوق جو اُن کے گلے کا ہار ہو رہے ہیں، اُتارتا ہے۔

محققین میں سے اکثر ایسے بھی تھے جو ضبط نہ کر سکے اور علانیہ ایسی باتیں کہتے جو شرعاً قابل مواخذہ سمجھی جائیں۔ اگرچہ تاریخ اسلام ان دل ہلا دینے والے خونی واقعات سے معرا ہے جو یورپ کے قرون وسطی میں عام رونما ہوئے۔ اہل علم و حکمت کو جادوگر قرار دیا جاتا اور زندہ آگ میں جلایا جاتا۔ ''گلسیلو'' نے دوربین کیا ایجاد کی اپنی آنکھیں زندان میں کھو بیٹھا۔ ایک واقعہ حسین منصور حلاج کا تذکروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ شیخ عطار اس کو قتیل فی سبیل اللہ اور شیر بیشہ تحقیق اور شجاع صفدر صدیق لکھتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کے بارہ میں مشائخ کی رائے مختلف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ تصوف سے واقف ہی نہ تھے مگر اب عطار و عبد اللہ حسیف اور شبلی اور ابوالقاسم نصیر آبادی جو ائمہ تصوف ہیں، اس کے اقوال قبول کرتے ہیں۔ استاد ابوالقاسم قشیری کہتے ہیں کہ اگر وہ بندہ مقبول ہوتا، خلق خدا کے نزدیک مردود نہ ہوتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بات یہ ہے کہ:

ہر سانحہ کہ شد بافسانہ دلیل — بیکاری خلق اُوراست کفیل
موسیٰ تاحال می شگافد دریا — فرعون تاحال غوطہ خورد بہ نیل

بات تو معمولی ہی ہو گی، یار لوگوں نے افسانہ بنا دیا۔ لیکن واقعہ ضرور غیر معمولی تھا۔ دنیا اسلام میں کافر و مُشرک بھی رہتے آئے ہیں اور کسی سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا۔ البتہ جو شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی ناسزا کلمہ کہے، دنیا اسلام کا شرارتاً مضحکہ اڑائے، ضرور قابل سرزنش سمجھا گیا ہے۔ ہسپانیہ میں اسلامی دورِ حکومت میں ایک مسیحی مسلمان ہو گیا۔ یہ جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ جب مسلمان ہوا تو حضرت مسیحؑ کی نسبت ناسزا کلمات برملا کہتا۔ لوگ پکڑ کر قاضی کے پاس لائے۔ قاضی نے نومسلم سمجھ کر سمجھایا کہ تمام انبیاء و رسل کا احترام ایک جیسا ہے مگر وہ اپنی ہٹ

Marfat.com

سے باز نہ آیا۔ قاضی نے قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ حسین منصور کی نسبت اتنا کہا جاتا ہے کہ وہ کہتا تھا، ''ان الحق''۔ قاضی کے پاس لائے تو قاضی نے کہا کہ کہو ''ھوالحق'' جواب دیا کہ ''ھو'' ضمیر غائب ہے ''حق'' تو حاضر ہے۔ اتنی سی بات پر فتویٰ کفر صادر کرنا بعید معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ آیات بینات قرآن کی شہادت واضح ہے کہ:

''وما خلقنا السمآء والارض ومابینھما باطلاً ذٰلک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا فی النار'' (۲۳/۱۲)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل پیدا نہیں کیا۔ ایسا ظن ان لوگوں کا ہے جو منکر حقیقت ہے۔ تو منکروں کے لیے جلنا ہے آگ میں۔''

جب تمام کائنات ایک حقیقت ثانیہ ہے تو انسان حق نہیں تو کیا ہے۔ غالباً لوگوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ یہ شخص دعویٰ خدائی کرتا ہے۔ مگر ''انا الحق'' سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا۔ حسین منصور کو جب قید خانہ میں بند کیا گیا تو وہاں بھی صلوٰۃ کا پابند ایسا ہی تھا جیسے عام مسلمان۔ کسی نے پوچھا کہ جب تو ''انا الحق'' کہتا ہے تو نماز کس کی پڑھتا ہے۔ جواب دیا کہ ''میں اپنی قدر خوب جانتا ہوں۔''

شیخ عطار بھی حیران ہیں کہ بات تو کچھ بھی نہ تھی جسے افسانہ کر دیا۔

در آورد در وادی ایمن کہ ناگاہ — درختے گویدت انی انا اللہ
روا باشد انا الحق از درختے — چرا نبود روا از نیک بختے

اب اشعار میں اشارہ آیہ مبارک کی طرف ہے کہ

''فلما اتھا نودی من شاطی الوادالایمن فی البقعۃ المبراکۃ من الشجرۃ ان یموسیٰ انی انا للہ رب العٰلمین'' (۲۰/۷)

''پس جب (موسیٰ نے طور کی جانب آگ کی روشنی دیکھی) اس طرف آیا تو وادیٔ ایمن جو مبارک زمین میں واقع ہے ایک درخت سے آواز سنی کہ اے موسیٰ تحقیق میں ہوں اللہ تمام عالموں کا پروردگار۔''

اس موضوع پر مزید بحث ہم مناسب مقام پر کریں گے۔ سردست ہم تصوف

Marfat.com

کی تاریخ بیان کر رہے ہیں۔ ابو محمد جریر طبری رحمتہ اللہ علیہ جو متقدمین میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ "قرنِ اوّل میں معاملہ دین سے تھا۔ آج دین فرسودہ ہو گیا۔ قرنِ دوم میں معاملہ وفا سے تھا وہ بھی مفقود ہے۔ قرنِ سوم میں معاملہ مروّت سے تھا وہ بھی اٹھ گئی۔ قرنِ چہارم میں معاملہ حیا سے تھا وہ بھی نہیں۔ اب باقی کیا رہ گیا۔" اگر آج کوئی ہم سے پوچھے تو ہم یہی کچھ کہیں گے اور ہر زمانہ میں اہل اللہ یہی کچھ کہتے آ رہے ہیں۔ شیخ سعدی کہتے ہیں کہ "ابتدا میں درویش تھے جن کا ظاہر حال خراب اور باطن آراستہ تھا۔ اب درویش ہیں کہ ظاہر حال تو آراستہ ہے مگر باطن خراب۔" امام ابو القاسم قشیری جو صاحب تصانیف ہیں، فرماتے ہیں کہ تبع تابعین کے بعد ہی حالات بگڑ گئے۔ ہر ایک سلف صالحین کے گن گاتا ہے اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن زمانہ ارتقائی منازل طے کرتا آ رہا ہے۔ ذہنی اور مادی ترقیات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ایک مؤرخ جب اس کے نشو و نما پر نظر کرتا ہے تو اس پر واضح ہوتا ہے کہ تصوفِ پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک بلکہ اس سے بھی کچھ عرصہ پیشتر علمی صورت اختیار کر چکا تھا لیکن اس عرصہ میں صوفیہ حضرات کے بہت فرقے بن چکے تھے جو اپنی سی روش پر چل رہے تھے جو ابتدا میں کسی پیر طریقت نے وضع کر دی۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّل مخاطب کفار مکہ تھے۔ اہل کتاب ان کو "اُمیین" طنزاً کہتے۔ اس لیے کہ وہ کسی صحیفہ آسمانی سے واقف نہ تھے۔ "اُمی" اصطلاح اہل کتاب کی ہے۔ اور قرآن میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ یعنی غیر اہل کتاب اس کے لغوی معنی "مادر زاد" یعنی جاہل۔ اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اصلاح اسی حد تک کر سکے، جتنی کہ ذہنی اور خارجی حالات نے اجازت دی۔ اس لیے دورِ اوّل میں ہم زیادہ تر عملی زندگی نمایاں دیکھتے ہیں۔ وہ علوم جو متمدن قوموں بالخصوص یونانیوں اور رومیوں میں رائج تھے، اس دور میں مسلمان ان سے واقف نہ تھے۔ اس دور میں وہ صرف علم دین ہی جانتے تھے اور علم دین جس کی عملی صورت صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج و صیام تھی، یہی کچھ سمجھتے تھے۔ ان ایام میں انہیں اس کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ارکانِ اسلام کی حقیقت فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھتے۔ لیکن اعتقاداً اور عملاً جو کچھ ارکان اسلام کا مقصد تھا، وہ ان کو بخوبی

Marfat.com

حاصل تھا۔ ایک خاص بات جوان کے ذہن نشین ہو چکی تھی "توحید" تھی اور یہ بات وہ اہل کتاب میں بھی بلاشائبہ شرک نہ دیکھ سکے۔ چونکہ ایمان باللہ اصل اصول اسلام ہے۔ ان کا ایمان اسی پر پختہ تھا اور اس ایمان کی پختگی نے ان میں وہ بات پیدا کر دی کہ ایک دنیا پر چھا گئے۔ وہ جو بھی عمل کرتے لوجہ اللہ کرتے، جس میں ان کی ذاتی اغراض کا دخل نہ تھا۔ ان کا پختہ ایمان اس امر پر تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال دیکھ رہا ہے اور ان کی نیتوں سے واقف ہے۔ اس لیے خوف خدا ان کے دلوں پر غالب تھا۔ اگر بہ تقاضائے بشریت کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو کانپ اٹھتا۔ یہ بات ان کے ذہن میں اچھی طرح نقش ہو چکی تھی کہ اللہ کا بندہ غیر اللہ کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ اور جو اللہ کے حضور جھکے گا، وہ غیر اللہ کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہ کرے گا۔ جو اللہ سے ڈرے گا، وہ مخلوق سے نہیں ڈرے گا۔ جس کا اللہ یار و یاور ہو خواہ تمام جہان اس کا دشمن ہو اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی ایمان باللہ نے ان کے حوصلے بلند اور عزم راسخ کر دیا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو کہا کرتے کہ جتنا تم زندگی سے محبت رکھتے ہو اس سے زیادہ ہم موت سے محبت رکھتے ہیں۔ فی سبیل اللہ مرنا وہ اعلیٰ مقصد زندگی یقین کرتے تھے۔ اس دور میں ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ لہو و لعب سے نفور تھے اور تعیش کے ساز و سامان سے ان کے گھر خالی تھے۔ وہ محنتی اور جفاکش تھے اور فی سبیل اللہ ہر ایک نیک خدمت کے لیے کمربستہ رہتے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف ان چھ ممتاز صحابہ میں سے تھے جن کی نسبت حضرت عمرؓ نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد ان میں سے ایک کو خلافت کے لیے منتخب کر لینا اور یہ برضا و رغبت خود ہی دست بردار ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ آپ مدینہ کے بازار میں ایک صحابی سے گفتگو کر رہے تھے کہ ایک وہ وقت تھا کہ مکہ سے ہجرت کر کے آئے اور ہم مفلس تھے۔ لیکن جب خیرات کے بارہ میں آیات نازل ہوئیں تو ہم میں سے ہر ایک اس کوشش میں لگ گیا کہ کچھ محنت و مشقت سے کمائے تاکہ خیرات کر سکے۔ ہماری یہ حالت تھی کہ ایک صحابی جنگ بدر میں شہید ہو گئے۔ ان پر ایک چادر ڈالی گئی لیکن اگر سر ڈھانپیں تو پاؤں ننگے رہتے اور اگر پاؤں ڈھانپیں تو سر ننگا رہتا۔ آخر پاؤں پر گھاس رکھی گئی۔ حضرت عبدالرحمٰن یہ واقعات بیان کرتے تھے اور رو رہے تھے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ تھے جو "مقصد حیات" حاصل کر گئے۔ آج دولت

Marfat.com

سے ہمارے گھر بھر گئے، معلوم نہیں ہم کس فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔ روتے روتے آپ کی ہچکی بندھ گئی۔ پیالہ ہاتھ میں تھا، گر پڑا۔ لیکن ہم واقعات سے اس موضوع کو طوالت دینا نہیں چاہتے جس کی تفصیل کتب تاریخ و سِیَر میں موجود ہے۔

اصحاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تو اہل زبان تھے۔ وہ قرآن حکیم کی ہر ایک آیت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان پر کیا موقوف ہے کفار مکہ جو اول مخاطب قرآن ہیں اور کسی صحیفہ آسمانی سے بھی واقف نہ تھے، آیات بینات قرآن اچھی طرح سمجھتے تھے اور کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ قرآن ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ کہا تو یہ کہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ یا اس کو اتنا بدل دو کہ ہمارے ٹھاکروں کی توہین نہ ہو۔ "بلاغ" اور "بلیغ" کلام ہے۔ اور "بلیغ" کی تعریف یہ ہے کہ ہر ایک فہم بلند و پست تک ہر ایک زمانہ میں رسا ہو۔ یہ تعریف قرآن ہی میں کی گئی ہے۔ "وعظهم و قل لهم فی انفسهم قولاً بليغاً" (۵/۶) "اور ان کو نصیحت کرو اور بات اس اسلوب سے بیان کرو جو ان کے نفوس میں اثر کرے۔" یہ جامع تعریف بلیغ کلام کی ہے، جو نفوس میں اثر کرے۔ یہ آیت تعریف اور ہدایت اور مثال کلام بلیغ کی ہے۔

ہر چند زمہر و ماہ و انجم گفتن صد نسخہ تا آخر و تقدم گفتن
گر بر سر انصاف رہی دشوار است یک حرف بقدر فہم مردم گفتن

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک اہل زبان، دوسرے ان میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا "اسوۂ حسنہ"۔ وہ قرآن کو بھی سمجھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے بھی شاہد تھے۔ اس لیے وہ رنگ رسالت میں رنگے گئے۔

"هو الذی ارسل رسوله، بالهدی و دین الحق لیظهرهٗ علی الدین كلم و كفی بالله شهیداً o محمد رسول الله ط والذین معه اشدآءُ علی الكفار رحماءُ بینهم ترامهم ركعاً سجداً، یبتغون فضلاً من الله ورضواناً سیماهم فی وجوههم من اثرا لسجود ط وعلی مثلهم فی التوراته مثلهم فی الانجیل كزرع اخرج شطاه فازرهٗ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقهٖ یعجب الزّراع لیغیظ بهم الكفار ط وعد الله الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت منهم

Marfat.com

مغفرةً وّ اجراً عظیمًا۔" (۲۶/۱۳)

"اللہ ہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت (برائے عالم انسانی بذریعہ قرآن) اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس پر دین کلہ واضح ہو اور اس پر اللہ کی شہادت کافی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو اس کے ساتھ (اصحابؓ) ہیں کفار پر تو بھاری ہیں مگر باہم رحم دل ہیں۔ تو ان کو دیکھتا ہے کہ رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے ہیں۔ اللہ کا فضل اور اس کی رضا جوئی کے طالب ہیں اور ان کے چہرے ہی صاف صاف نشان بتاتے ہیں (کہ یہ اصحاب رسول ہیں) سجدہ کے اثر سے۔ یہ ہے مثل ان کی توراۃ میں، مثل انجیل میں کہ جیسے کھیتی کہ ابتدا میں (کمزور) نشوونما اس کا ہوتا ہے۔ پھر طاقت پکڑتی ہے۔ پھر موٹی ہوتی ہے اور کھڑی ہو جاتی ہے، اپنے پاؤں، پر (ساق پر) کاشت کار کو خوش لگتی ہے اور غیظ میں لاتی ہے کفار کو۔ اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو ایمان لائیں گے اور اس کے مناسب نیک عمل کریں گے۔ ان میں سے ان کے واسطے بخشش اور اجر عظیم ہے۔"

یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ انبیاء و رسل کو بحیثیت درجات "صدیق" اور "شہید" اور "صالح" قرآن میں کہا گیا ہے اور درجات اعمال سے وابستہ ہیں۔ "کل درجت مما عملو" (۲۶/۲) "ہر ایک کے لیے اس کے اعمال کے مناسب درجات ہیں۔" حضرت ابراہیمؑ اور ادریسؑ کو "صدیق" کہا گیا ہے (۶۔۱۶/۷) حضرت عیسیٰؑ کو "شہید" (۷/۶) لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ عام صدیق اور شہید ہیں۔

"اولیک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم" (۲۷/۱۸)

"وہ اپنے پروردگار کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں، واسطے ان کے ہے اجران کا اور نوران کا۔"

اس لیے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ بلحاظ ایمان وعمل اصحابِ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ اکثر انبیاءؑ سے بھی اعلیٰ و ارفع ہے۔ کیونکہ اکثر انبیاء صرف صالحین ہی تھے۔

Marfat.com

اس میں کچھ شک نہیں کہ ''تصوف'' تبع تابعین کے بعد رفتہ رفتہ علمی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مگر بہرحال یہ ''قال'' تھا اور جسے ''حال'' اصطلاحِ تصوف میں کہتے ہیں اس کا اطلاق اصحاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بدرجہ اولیٰ ہوتا ہے۔ اس لیے عارف رومیؒ بھی کہتا ہے کہ:

قال راہگذار و مردِ حال شو　　　پیش مردِ کاملے پامال شو

باتیں بنانا چھوڑ و اور مرد حال ہو اور کسی کامل آدمی کی خدمت کر۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود　　　پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

جو عقلی باتیں کرتے ہیں یہ لکڑی کے سہارے پر چلتے ہیں اور لکڑی کے پاؤں میں تمکنت کہاں ہو سکتی ہے۔

گر باستدلال کار دیں بدے　　　فخر رازی راز دار دیں بدے

اگر عقلی استدلال سے دین میں کام نکل سکتا تو فخر الدین رازی بھی دین کا راز دار ہوتا۔

ایک اور محقق لکھتا ہے کہ:

صد کتاب و صد ورق در نار کن　　　خفتہ دل را یک دمے بیدار کن

سو کتابیں اور سو ورق آگ میں جھونک دے، سوئے ہوئے دل کو ذرا جگا۔

مولانا جامی کا ارشاد ہے کہ:

رو نفی وجود کن کہ در خود یابی　　　چیزے کہ نیابی درفصوص ولمعات

جا اور وجود موہومہ ماسوائے حق تعالیٰ کی نفی کر، تجھ کو وہ چیز ملے گی جو تصوف کی کتابوں ''فصوص الحکم'' اور ''لمعات'' میں نہیں مل سکتی۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ

محال سعدی کہ راہ صفا　　　تواں رفت جز در پے مصطفٰے
خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　　کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

Marfat.com

غرض تمام محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ تصوف فلسفیانہ قیل و قال نہیں۔ باتوں کے لڈو نہیں کہ کسی کا پیٹ بھرے۔ دماغی تعیش ضرور ہے۔ البتہ علم و حکمت اور شے ہے۔ اور اصحابِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی حالی تھی۔ اسے ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

مولانا جامی نے ''نفحات'' میں ''حاتم اصمؒ'' اور ان کے مرید ''شفیق بلخی'' کو طبقہ اولیٰ میں جگہ دی ہے جو دوسری صدی ہجری کے اوّل میں تھے۔ ایک روز حاتم اصم نے شفیق سے پوچھا کہ اتنے سال میری صحبت میں رہے کس قدر تحصیل علم کی اور کتنا فائدہ ہوا۔ شفیق نے جواب دیا ''علم وہی ہے جو فائدہ مند ہے۔ مجھے تو صرف آٹھ فائدے حاصل ہوئے''۔ حاتم اصم نے کہا ''انا لله و انا اليه راجعون ، '' اتنے سال اور صرف آٹھ فائدے؟ شفیق نے کہا کہ ''ہاں صرف آٹھ اور مجھے اس سے زیادہ ضرورت بھی نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ دنیا و آخرت میں یہی میرے لیے کافی ہے۔'' حاتمؒ نے کہا کہ ''اچھا بتاؤ کہ وہ آٹھ فائدے کیا ہیں۔'' جواب دیا کہ (ا) ''میں نے دیکھا کہ ہر ایک شخص کی کسی نہ کسی شے سے محبت ہے اور اس محبت کی انتہا قبر تک ہے۔ میں نے سوچا کہ ایسی شے کی محبت ہونی چاہیے جو قبر و حشر میں بھی مفارقت نہ کرے۔ مجھے آیاتِ قرآن سے معلوم ہوا کہ وہ ایمان باللہ ہے اور عمل صالح ہے۔ یہی مجھے محبوب ہے۔'' حاتم نے کہا، ''احسنت۔'' دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ''میں نے لوگوں کو مختلف احوال میں مبتلا پایا اور دیکھا کہ ہر ایک شخص کم و بیش ہوا و ہوس کا بندہ ہے۔ میں نے آیہ مبارکہ میں غور کیا، 'واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هى المارى ، '' مجھے یقین ہو گیا کہ ارشادِ قرآن حق ہے۔ اس لیے میں نے خواہشاتِ نفس پر لات ماری۔ یہاں تک کہ میرا نفس اطاعتِ حق پر راضی ہو گیا۔''

مولانا جامیؒ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ شفیق اور حضرت ابراہیم ادھمؒ میں گفتگو ہوئی۔ شفیق نے پوچھا کہ ''آپ کے معاش کی کیا حالت ہے؟'' ابراہیمؒ نے کہا کہ ''آ گئی تو روزی پر شکر کیا نہ ملی تو صبر کیا۔'' شفیق نے کہا کہ ''اتنی بات تو خراسان کے کتوں میں بھی ہے، میرا یہ حال ہے کہ روزی ملی تو خیرات کی اور اگر نہ ملی تو شکر کیا۔'' ابراہیمؒ نے اٹھ کر شفیق کا سر چوم لیا۔

تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے اہل دنیا کو دیکھا کہ ادنیٰ زندگی کے فائدہ کے لیے انتہائی محنت و مشقت کرتے ہیں۔ اگر مقصد حاصل ہوا تو خوش وخرم ہوئے اور اگر فوت ہوا تو رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ میری رہنمائی قرآن کی اس آیت نے کی۔

"ولا تشترو بعهدالله ثمناً قليلاً ط انما عند الله هو خير لّكم ان كنتم تعلمون o وما عندكم ينفد وما عند الله باقٍ ط ولنجزينّ الّذين صبرو اجرهم باحسن مانوا يعلمون o من عمل صالحاً من ذكر او انثىٰ وهو مومن فلنحيينّه' حيواةً طيبةً ولنجزينّهم اجرهم باحسن ما كانو يعلمون ۔"
(١٤/١٩)

"اور اللہ کے عہد کے بدلے قلیل مول نہ لو۔ اگر تمہیں علم ہو تو سمجھ سکتے ہو کہ جو شے اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے۔ جو کچھ تمہارے نزدیک ہے (دُینوی زندگی کے فوائد، حیواۃ الدنیا کی متاع قلیل) وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے نزدیک ہے باقی رہنے والا ہے۔ (والاخرۃ خیر وابقیٰ) البتہ ہم ان لوگوں کو جزا دیں گے جو صبر کرتے ہیں۔ ان کے عمل کے احسن اجر ہیں اور جو بھی نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی میں زندہ کریں گے اور ان کے اعمال کا احسن اجر بدلہ میں دیں گے۔"

اس لیے میں نے اپنا مال فی سبیل اللہ خرچ کر دیا۔ چوتھا فائدہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اعلموا انما الحيٰوة الدنيا لعب و لهو وّ زينة وّتفاخر بينكم و تكاثر فى الاموال والاولاد ط كمثل غيث اعجب الكفار نباته ثم يهيج فتراهه مصفرّاً ثم يكون حطاماً ط وفى الاخره عذاب شديد وّ مغفرةٌ مّن الله و رضوان ط وما الحيٰوة الدنيا الا متاع الغرور o سابقوا الى مغفرةٍ مّن رّبكم وجنّةٍ عرض اكعرض السّمآء والارض اعدّت للّذين اٰمنوا بالله ورسلهٖ ط ذٰلك فضل الله يؤتيه من يّشآء ط والله ذو الفضل العظيم o"
(٢٧/١٨)

"اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ ادنیٰ زندگی تو صرف لہو ولعب اور آرائش و زیبائش

اور باہمی تفاخر اور مال اور اولاد میں کثرت ہے۔ اس کی مثل مینہ کی ہے اور (جب برستا ہے تو) کاشتکاروں کو خوش لگتا ہے اور ہریاول کا اگنا اور اس کا لہلہانا (بھلا معلوم ہوتا ہے) پھر تُو مشاہدہ کرتا ہے کہ زرد پڑ جاتی ہے۔ آخر روندن میں آ جاتی ہے اور انجام کار (اس میں دونوں امکانات ہیں) عذاب شدید (اگر فی سبیل مفسدین صرف ہو) اور بخشش اور اللہ کی رضا مندی اور یہ ادنیٰ زندگی تو بس نری دھوکے کی ٹٹی ہے۔ جلدی سے بڑھ کر لو اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کو جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض جیسا ہے، جو ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ ہے فضل اللہ کا جسے چاہے دے اور اللہ صاحب فضل عظیم ہے۔"

میں نے اہل دنیا کو دیکھا کہ اسی متاع قلیل وغرور کے پیچھے پڑ۔ے ہیں اور اسی کو شرف اور بزرگی اور علو مرتبہ سمجھتے ہیں۔ میں نے اس آیہ کریمہ میں نظر کی کہ:

"انّ اکرمکم عند اللہ اتقکم" "درحقیقت تم میں سے شرف اور بزرگی اسی کی اللہ کے نزدیک ہے جو متقی ہو۔"

اس لیے میں نے تقویٰ اختیار کیا۔

(پانچواں فائدہ) مجھے علم سے یہ ہوا کہ ہر ایک شخص اور ہر ایک جماعت اور قوم اپنی بڑائی بیان کرتی ہے اور دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی تحت میں "حسد" کارفرما ہے۔ ایک دوسرے کی دولت اور عزت پر حسد کرنا۔ میں نے کلام الٰہی میں نظر کی کہ "نحن قسمنا منھم معیشتھم فی الحیوٰۃ الدنیا" "ہم نے تم میں اس ادنیٰ زندگی کی معاشیات تقسیم کی ہیں۔" میں نے سوچا کہ قسام ازل نے یہ تقسیم فرمادی ہے اس کی تقسیم پر حسد کرنا شیطنت ہے۔ اس لیے میں نے "حسد" سے کنارہ کشی کی اور جو مجھے ملا اسی پر قناعت کی۔

علم کا چھٹا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میں نے لوگوں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کے ہر ایک عمل میں شیطنت کم وبیش پائی۔ ایک دوسرے کا دشمن، خواہ اس کا شعور اسے نہ ہو، دشمنی کسی خاص غرض یا سبب سے۔ میں نے اس آیہ کریمہ میں نظر کی کہ:

"ان الشیطٰن لکم عدواً فاتخذوہ عدوا ۔" "بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے، تم بھی اس کے دشمن بنو۔"

Marfat.com

میں نے سمجھ لیا کہ شیطان ہی بنی نوع انسان کا دشمن ہے۔ میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آیا۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

''الم عهد عليكم يٰبنى اٰدم ان لا تعبدوا الشيطٰن انه' لكم عدو مبين و ان اعبدونى هذا صراطٌ مستقيم۔'' کیا میں نے اے اولادِ آدم تم سے یہ عہد (فطرت) نہیں باندھا تھا کہ شیطان تمہارا اعلانیہ دشمن ہے اور یہ کہ (اس کا اتباع نہ کرو) میری ہی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔''

میں نے شیطان کا اتباع نہ کیا اور اللہ کی عبادت خالص کرتا ہوں۔

ساتواں فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ طلب معاش میں جائز و ناجائز اور حلال وحرام میں بھی تمیز نہیں کرتے۔ ''رزق کریم'' اور ''رزق طیبہ'' ہی کے لیے کوشش واجب ہے اور جب میں نے آیہ مبارکہ میں نظر کی کہ:

''وما من دابة فى الارض الا على الله رزقها۔'' اور یہ کہ ''كلوا واشربوا ولا تسرفوا۔''

تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خالق اور رازق تو اللہ ہے۔ وہی میرے رزق کا ضامن بھی ہے اور میری پیدائش سے پیشتر ہی رزق مہیا کر رکھا ہے۔ روئے زمین پر کون سی شے ہے جو انسان کی پیدا کردہ ہے۔ انسان تو ایک ذرّہ بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ میری تسلی ہو گئی۔ میں نے رزق حلال ہی میں فائدہ سمجھا اور مزے میں ہوں۔ ''اسراف'' سے کنارہ کیا تو آرام میں ہوں۔

آٹھواں فائدہ مجھے یہ ہوا کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ہر ایک شخص کسی نہ کسی شے پر بھروسا کیے ہوئے ہے۔ کوئی مال پر، کوئی اولاد پر، کوئی صنعت پر، کوئی حرفت پر، کوئی عقل پر، کوئی علم پر۔ میں نے آیہ کریمہ:

''ومن يتوكّل على الله فهو حسبه'' جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے وہی اس کے واسطے کافی ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو گی کہ ''ان اللّٰه يحب المتوكلين'' اللہ توکل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے اور ''هو حسبى و نعم الوكيل۔'' وہی کافی اور ذمہ دار ہے۔ میں نے توکل علی اللہ اختیار کیا۔ مجھے اللہ کی محبت کے سوا اور کچھ نہ چاہیے۔

حاتم اصمؒ نے کہا کہ شقیق تو نے علم کا صحیح فائدہ اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ تجھے مبارک

کرے اور تیرا علم زیادہ سے زیادہ ہو۔

انبیاء ورسل نے بہت دعائیں مانگیں۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ ''قل ربی زدنی علما۔'' اے میرے پروردگار میرا علم زیادہ کر۔

قیاس ہوسکتا ہے کہ اکثر صحابہ کرام کو تمام قرآن ازبر یاد تھا اور اکثر ایسے بھی تھے جن کو اکثر یاد تھا اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کو اس کا کوئی جزو حفظ نہ ہو۔ دوسرے ان کے علو مرتبہ و درجات کا قیاس ہوسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود تھے۔

''لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایٰتہ ویزکّیھم ویعلّمھم الکتٰب والحکمۃ'' (۴/۸)

''اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان مومنوں پر ہے کہ انہی میں سے ایک معزز رسول مبعوث فرمایا جو ان پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو (تمام عیوب سے) پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور اس کی حکمت سکھاتا ہے۔''

جسے حقیقی تصوف کہتے ہیں وہ بقول امام قشیری تبع تابعین پر ختم ہوگیا۔ اس تشریح کے بعد ضرورت تو نہیں کہ اب اس موضوع پر بحث کی جائے کہ ''تصوف'' اور ''سوفسطا'' میں کیا مماثلت ہے۔ ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''۔ لیکن مروجہ حالیہ تصوف میں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے؛ جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس لیے ہر ایک محقق کے لیے یہ واجب ہے کہ دریافت کرے کہ یہ آمیزش کب اور کیسے ہوگئی؟

جب اہل عرب ایران اور شام اور شمالی افریقہ بلکہ ہسپانیہ کو مسخر کر چکے تو مغلوب اقوام سے اختلاط ناگزیر امر تھا۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کے علوم وفنون سے واقفیت بھی پیدا ہوگئی۔ اہل عرب خود بھی علم دوست تھے اور قرآن اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ہی محرک تھے کہ علم جہاں سے ملے اپناؤ۔ اس وقت دنیاء اسلام دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی، جس کی تہ میں اُموی اور ہاشمی دیرینہ رقابت کارفرما تھی۔ مشرق میں بغداد اور مغرب میں ''کارڈوا'' (قرطبہ) واقع ہسپانیہ دو علمی مرکز تھے۔ ان ایام میں یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ اہل عرب ہی تھے جنہوں نے فیثا غورث اور افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کو ازسرنو زندہ کیا۔ نہ صرف ان فلسفیوں کے

مقالات بلکہ ان کتب کا بھی عربی میں ترجمہ کیا جو ان مقالات کی شرحیں تھی۔ جن میں کچھ جدت بھی پائی جاتی تھی۔ جسے فلسفہ، فلاطونیات کہتے ہیں اور اسی پر قناعت نہ کی بلکہ اس فلسفہ پر کچھ اور قابل قدر اضافہ بھی کیا۔ ان ترجموں میں نہ صرف فلسفہ بلکہ دیگر علوم ریاضی اور منطق، طب اور ہیئت وغیرہم بھی شامل تھے۔ جب ایک دفعہ یہ علمی تحریک شروع ہوگئی تو اس کا اثر بھی ناگزیر امر تھا۔ حکما اسلام نے مذہب کو بھی فلسفیانہ رنگ دیا۔ موضوع بحث اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء و صفات اور مسئلہ جبر و قدر وغیرہ عرصہ تک رہا، اور کئی ایک فرقے خاص خاص عقائد لیے ہوئے بن گئے۔ ان میں سے دو ممتاز تھے۔ ایک معتزلہ اور دوسرے ''اشعریہ''۔ معتزلہ کے نزدیک استدلال عقائد ہی صداقت کا واحد معیار تھا۔ اس لیے ان لوگوں نے ایسے عقائد کا انکار کر دیا یا ان کی معقول توجیہہ کی جو عقل کے لیے قابل قبول نہ تھے۔ ان کے خلاف اشعریہ براہِ عقلیہ کو واحد معیارِ صداقت قرار نہیں دیتے اور حیات معہ ممات اور حشر و نشر و رویت وغیرہ کے ایسے ہی قائل تھے جیسے عامۃ المسلمین ہیں۔ یونانی فلسفہ کے زیر اثر ہی مجلس ''اخوان الصفا'' کے اکاون مقالات مرتب ہوئے جو تمام علوم پر مشتمل ہیں اور جن کو دائرۃ المعارف کہنا چاہیے۔ اس کے بعض مقالات کا اردو ترجمہ میں نے بھی ابتدائی عمر میں دیکھا ہے۔ الکندی اور الفارابی اور بوعلی سینا کے علم و حکمت کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ حضرات بلاشبہ یونانی فلسفہ کے زیر اثر رہے مگر انہوں نے افلاطون اور ارسطو سے بھی اختلاف کیا اور ان کی غلطیاں بھی واضح کیں۔ ان کا اصل اصول تحقیق یہ تھا کہ فلسفہ میں علم منطق سے مدد لینی چاہیے اور امور دین کے لیے مطالعہ فطرت کرنا چاہیے۔ لیکن حکما اسلام مذکورہ کے نظریوں میں بھی اختلاف ہے۔ جس پر بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ابن مسکویہ اور امام محمد غزالی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنہوں نے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اول الذکر نے تو مکارم اخلاق پر بہت کچھ لکھا اور جس کے بعد حکما اسلام نے جو کچھ اخلاق پر لکھا ابن مسکویہ کے اتباع ہی میں لکھا۔

امام محمد غزالی نے فلسفہ کا رد کامیابی سے کیا اور اس حد تک کیا کہ کسی فلسفی سے جواب نہ بن پڑا اور حکومت وقت کے اشارہ پر فلسفیانہ طومار شارع عام میں اکثر جگہ جلایا گیا۔

Marfat.com

امام غزالی کی تصانیف میں سے زیادہ تر مشہور ''احیاء العلوم والدین'' عموماً صوفیہ کرام کے حلقہ درس میں رہی ہے۔ مناسب مقام پر اس کا حوالہ اور اقتباس دیا جائے گا۔ سرِدست ہم اس اثر کا ذکر کر رہے ہیں، جو فلسفہ یونان کا ''تصوف'' پر ہوا۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ صوفیہ محققین امام غزالی اور محی الدین ابن عربیؒ اور متاخرین نے فلسفہ کے رد میں بہت کچھ لکھا۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسی کا اثر تھا کہ تصوف کو پانچویں اور چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا گیا اور تصوف نے علمی صورت اختیار کر لی اور نئی علمی بحثیں پیدا ہوگئیں اور سوفسطائیہ کی بعض معقول باتوں کو تسلیم بھی کر لیا۔ خود امام غزالی ''تہافتہ الفلاسفہ'' میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب دو فریق کسی علمی بحث پر بحث کرتے ہیں تو ہر ایک فریق اپنے اپنے عقائد کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے اور فریق مخالف کی ہر ایک بات کو رد کرتا ہے، خواہ کتنی ہی معقول اور ثابت شدہ حقیقت ہو۔ یہ طریق بحث انتہائی نامعقول ہے اور اہل تحقیق اور انصاف کے نزدیک مردود ہے۔ اس کے بعد اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ میں نے ہر نامعقول بات کا رد کیا اور معقول کو پسند کیا اور تسلیم کیا اور اہل علم کے نزدیک اس میں کچھ سبکی نہیں بلکہ داد تحقیق ہے۔

یہ اثر تو مغرب کے فلسفہ کا تھا جو شام کے راستہ آیا۔ دوسرا اثر مشرق کا ایران کی راہ سے داخل ہوا۔ اس میں ویدانت اور بدھ مت کے نظریوں کی بھی آمیزش ہے۔ فلسفہ یونان میں ''ہمہ از وست'' کا نظریہ ہے اور ایرانی فلسفہ کا نظریہ ''ہمہ اوست''۔ تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ سردست اس کی ابتدائی تاریخ یعنی وہ حالات بیان کیے جاتے ہیں جن کے تحت اس کا داخلہ اسلامی تصوف میں ممکن ہوگیا۔

ایرانی تہذیب وتمدن بہت پرانا ہے اور ان لوگوں کا مذہب اگرچہ بے شمار فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا مگر اس کی قدامت میں کلام نہیں۔ جب ایران مسخر ہوگیا تو خلافت راشدہ میں اس سے کچھ تعرض نہ کیا گیا۔ اور یوں تو جبر و اکراہ اسلام میں ممنوع ہے مگر ان میں تبلیغی فرض بھی ادا نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ ان ایام میں مسلمانوں کی توجہ کسی اور طرف لگی ہوئی تھی۔ اُموی خلافت کے دَور میں ایرانی جوق در جوق اسلام قبول کرتے گئے۔ اہل عرب سپاہی تھے اور اس کے ساتھ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، ان کی عملی

Marfat.com

زندگی ہدایاتِ قرآن کے مطابق شائستہ اور پاکیزہ تھی۔ ایرانی اکثر اہل علم وقلم تھے۔ ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو بظاہر اسلام قبول کر چکی تھی مگر ان کے دلوں میں ''ژند اوستا'' رچا ہوا تھا۔ ژند زبان ہے ''اوستا'' کی جو پارسیوں کی مقدس کتاب ہے۔ عرصہ تک مسلمانوں پر ان کی منافقت کا حال نہ کھلا۔ مگر جب یہ راز فاش ہو گیا تو ہر ایک ایرانی کو جو صوفیانہ لباس میں معرفت کی باتیں کرتا مگر ان میں اپنے عقائد ہی کی تعلیم کرتا، ''زندیق'' سے موسوم کیا۔ یہ لفظ ''ژند'' کا معرّب ہے۔

چنانچہ مولانا جامیؒ لوائح میں ایک رباعی میں اس عقیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اے بردہ گمان کہ صاحب تحقیقی واندر صفت صدق و یقین صدیقی
ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

انسان اگرچہ جمادات (طین) سے ہی بنا ہے اور اسی طرح کل طبقہ نباتات و حیوانات کی ابتدا بھی طین ہی سے ہوئی، لیکن تفاوت درجات اگر ملحوظ نہ رہیں تو گدھا اور انسان سب ایک ہی ہیں۔ اس موضوع پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔ غرض دو اطراف سے تصوف اسلامی میں نظریہ ''ازوست'' اور ''اوست'' داخل ہو گیا۔ اسی کو توحید ''وجودی'' اور توحید ''شہودی'' سے موسوم کیا گیا۔ عموماً محققین صوفیہ ''وحدت، وجودؔ'' کے قائل ہیں۔ ایک دفعہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقہ درس میں اسی مسئلہ توحید اور حکما اسلام کے مختلف نظریہ پر بحث چل پڑی۔ شاہ صاحب سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں منسلک تھے۔ شاہ صاحب نے ''وحدت وجودؔ'' کی تائید میں چند دلائل پیش کیے۔ ایک شاگرد نے کہا کہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی نے جو اس سلسلہ کے پیشوا ہیں وحدتِ وجود کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے اور آپ انہی کے سلسلہ میں ہیں۔ کس طرح مجدد صاحب کے مخالف عقیدہ کی حمایت فرما رہے ہیں؟ شاہ صاحب سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ اگر پیر کا اتباع اس نہج سے واجب ہو تو مجدد صاحب کے پیرانِ طریقت سب وجودی تھے۔ مجدد صاحب نے ان کی مخالفت کیوں کی؟ اس کے بعد شاہ صاحب نے اصولِ اتباع کی وضاحت کی اور کہا کہ پیر طریقت کا اتباع ایک خاص حد تک ہے۔ سالک راہ پر جو کچھ مکشوف ہو وہ اس کی اپنی تحقیق ہے۔ اتباعِ شخصیت تو شرک و کفر کے گڑھے میں بھی دھکیل

Marfat.com

دیا کرتا ہے، ع

"کفر گیرد کاملے ملت شود"

جو پیر کی شخصیت کا اتباع کرتے ہیں وہ اس کی غلطیوں کا بھی کریں گے۔ اس موضوع پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔ سر دست دیکھنا یہ ہے کہ یہ تصوف جس کا عملی نمونہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین اور تبع تابعین تھے۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ کی آمیزش سے کس صورت میں رونما ہوا۔ یونانی فلسفہ کو خود اہل عرب نے زندہ کیا، لیکن ایرانی زندقہ نے خود مداخلت کی اور ارادۃً کی، کہ مسلمانوں کے عقائد میں رخنہ ڈالا جائے۔

"دبستان مذاہب" کی تصنیف محسن فانی سے منسوب ہے جو مغلیہ شہنشاہ عالمگیر کا ہم عصر تھا۔ اس کتاب کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے مختلف مذاہب اور اہل مذاہب کے عقائد خود ائمہ مذاہب سے مل کر ان کی زبانی جو کچھ سنے، قلم بند کیے۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ ان مذاہب کے دشمنوں نے جو کچھ ان مذاہب کی نسبت قیاس کیا تھا، لکھا۔ اس لیے "دبستان مذاہب" کی شہادت ان مذاہب کی نسبت قابل اعتبار ہے۔ مصنف دو دفعہ محمد سعید سرمد سے بھی ملا۔ اس کی بابت وہ لکھتا ہے کہ اصل میں یہودی تھا۔ مسلمان ہو گیا اور پھر ایران سے ہوتا ہوا "ٹھٹھہ" واقع سندھ میں آیا اور ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہو گیا۔ اس کی وضع جوگیوں کی سی تھی، ننگا رہتا اور اسی ہندو کے گھر کے آگے دھونی رما کر ڈیرہ جما دیا۔ ہندوؤں کو جوگیوں سے انتہائی عقیدت ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب باپ کو اصل حالات کا علم ہوا تو لڑکے کو سرمد کی خدمت کا حکم دیا۔ سرمد نے لڑکے کو تعلیم دی۔ پھر یہاں سے روانہ ہو کر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ مصنف کہتا ہے کہ پہلی دفعہ میری ملاقات دکن میں ہوئی۔ اس نے ایک قصیدہ وزیر کی مدح میں لکھا تھا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار بھی مصنف نقل کرتا ہے۔ مصنف کی استدعا پر سرمد نے اصل عبرانی سے توراۃ کے پہلے چند باب فارسی میں ترجمہ کر کے دیے، جو مصنف نے بلفظہٖ "دبستان" میں درج کر دیے۔ دوسری دفعہ مصنف کی ملاقات سرمد سے بندرگاہ سورت میں ہوئی۔ مصنف کسی جگہ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتا جو سرمد کے قتل کے متعلق مشہور ہے۔ اس واقعہ کو شہرت صاحب "سیر المتاخرین" غلام حسین نے دی جو انگریزی عہد میں لکھی گئی۔ جہاں تک میں نے تحقیق کی یہ واقعہ ہی ایک افسانہ ہے۔ مصنف نے بالخصوص ایرانی مذاہب پر تفصیلی بیان

Marfat.com

لکھا ہے۔ جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصنف ایسے کئی اشخاص کا ذکر کرتا ہے جو صحیح معنی میں ''زندیق'' تھے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ میرے مراسم دوستانہ تھے۔ وہ مسلمان بظاہر تھے اور نام بھی مسلمانوں کا تھا مگر اس لباس میں گبری عقائد نشر کرتے تھے۔ اصل نام بھی ان کا گبری تھا۔ یہ ایک منظّم سازش عرصہ دراز سے جاری تھی۔ فقیرانہ لباس میں جس کا احترام ہر ایک شخص کرتا لوگ دھوکا کھا جاتے۔ عقیدت مندوں کو اسرار دین یہی گبری عقائد (۱) بتاتے۔

ہمارے زمانہ میں قاسم زادہ نے ''جلوہ ریزی روح ایران'' لکھی جو ایران میں شائع ہوئی ہے۔ کتب خانہ بمبئی سے بھی دستیاب ہوسکتی ہے۔ اس شخص ۔نے واشگاف الفاظ میں وہ راز افشا کر دیا اور فخریہ کہا جو آج تک پردہ ہی میں تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ عربوں نے نہ صرف ہماری قدیم عظیم الشان سلطنت ہی کا تہس نہس کیا بلکہ ہماری تہذیب وتمدن اور اس کے ساتھ ہمارے مذہب کو بھی مٹا دیا۔ اور رفتہ رفتہ ہماری مقدس زبان ژند پر بھی

---

(۱) مذاہب ''آخشیان'' کے تحت لکھتا ہے کہ:

''صاحبان ایں مذاہب ہمہ با اہل اسلام امیختہ اند و مکتوب ایشاں جلوہ گرند و نام مسلماں ہم دارند نام دیگر بر کیش خویش و در بلاد ایران و توران متفرق اند... راقم ازیں گروہ شیداب نامی را در لباس بازرگانی در سال ہزار چہل ہجری دید و آنچہ نگاشتہ از وشنیدہ و از نامہ آخش خواندہ وہمیں شیداب مشہور بہ شمس الدین را رسالہ ایست در تقویت آئین خویش مدلل بآیات قرآنی واحادیث واز آباد نام۔''

عقیدہ مزدکیاں کے تحت لکھتا ہے کہ:

''شیراب و آئین ہوش پویائی کیش او بودند و دیگر محمد علی کرد و اسماعیل، بیگ گبری واحد تیرائی بکیش ایشاں گردیدند وازیشاں شنیدہ شد کہ اکنوں مزدکیاں در لباس گبری نیستند درمیاں اہل اسلام پنہاں شدرہ سپر کیش خویش اند و کتاب مزدک را کہ موسوم است بہ ویسناد بہ نامہ نگار نمودند پارسی پاستانیست و آں را آئین ہوش آئین شکیب بزبان ہمہ معروف پارسی ہم ترجمہ کردہ وفرہاد مردے بود و انا نزد اہل اسلام خود را محمد سعید نامیدے و شیراب خویش را شیر محمد خواندے و آئین ہوش خود را محمد عاقل باز نمودے و چوں در علم خویش ماہر بودند نامی کہ ویسنادی است ہم داشتند۔''

Marfat.com

عربی قابض ہوگئی۔ ہمارے بزرگوں نے جب دیکھا کہ ہم تابِ مقاومت نہیں رکھتے تو بظاہر مسلمان ہو گئے کہ زندہ رہ کر عربوں میں مل جل کر اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کی۔ سب سے پہلے انہوں نے اہل بیت کا ساتھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اُموی حکومت کا اقتدار تھا جو خالص متعصب عربی حکومت تھی اور تمام عرب اس کا پشت پناہ تھا۔ ہمارے بزرگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اموی حکومت کا تختہ الٹ جائے تو ہمیں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی شان وشوکت کو زندہ کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ہاشمی اور اُموی رقابت نے ہمارا کام آسان بنا دیا۔ اور حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد نے ہم پر اعتبار کیا۔ ایک صدی کی جدوجہد کے بعد اُموی حکومت ختم ہوگئی۔ ہاشمی عباسی جانشین ہو گئے تو ہم نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اگرچہ خلافت عباسیہ میں ہمارا کافی دخل تھا اور برمکی وزارت کے دور میں ہم کافی طاقت وَر بن گئے مگر ہماری اصل غرض اور مقصد پورا نہ ہوا۔ کیونکہ جس طرح عباسیہ نے عربوں کے مقابل ہماری حوصلہ افزائی کی، جب دیکھا کہ ہم کافی طاقت وَر ہو گئے تو ترکوں کو ہمارے مقابلہ کے لیے کھڑا کر دیا۔ معتصم باللہ کے عہد خلافت میں ہم پھر گر گئے۔ مگر ہمارے بزرگ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور ہماری تحریک آزادی مختلف پیرایہ میں جاری رہی۔ یہاں تک کہ عربوں سے بالکل گلوخلاصی ہوئی تو ترکوں اور مغلوں کو بھی ہم نے نیچا دکھایا۔ اب جب کہ ہم بالکل آزاد ہو چکے ہیں، ہماری اپنی قومی سلطنت قائم ہو چکی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر عربی زبان اور عربی مذہب مسلط رہے۔

عربی زبان کے خلاف تو ایران میں ایک عرصہ سے علانیہ تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جب مولوی محمد حسین آزاد دہلوی ایران گئے تو یہ تحریک زوروں پر تھی۔ مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اتنی جلدی نہ کرو اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار تحریر میں نامناسب ہے۔ رفتہ رفتہ بتدریج زبان میں اصلی فارسی پہلوی الفاظ استعمال کرو۔

بلدہ حیدرآباد دکن میں ایک ایرانی قادر الکلام نے کئی جلدوں میں ''داستان ترکتازان ہند'' لکھی۔ یہ خالص فارسی زبان میں ہے۔ میں نے بھی اس کا مطالعہ کیا۔ غالباً اس کا سمجھنا ہر ایک شخص کے لیے اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا میرے لیے۔ مگر مصنف نے ایک جلد میں الفاظ کا فرہنگ بھی شامل کر دیا۔ حضرت غالب نے بھی خالص فارسی میں طبع

آزمائی کی اور مقالہ ''دستبو'' لکھا۔ غالباً غالب کی غرض تو کچھ اور تھی۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ان تاریخی واقعات کے تذکرہ میں یہ بات خاص قابل ذکر ہے کہ ''زنادقہ'' کو خاص مہارت احادیث وضع کرنے میں تھی اور تصوف کی کتابوں میں بعض ایسی احادیث جو روایتاً اور درایتاً موضوع یا ضعیف ثابت ہو چکی ہیں، انہی حضرات کی وضع کردہ ہیں۔ خلافت عباسیہ میں ایک ''زندیق'' عبدالکریم نامی تھا جو ''وضاع'' کے لقب سے مشہور ہے، یعنی بہت بڑا واضع احادیث۔ جب گرفتار ہوا تو کہا ''جو چاہو مجھ سے سلوک کرو میری احادیث طول وعرض دنیائے اسلام میں شائع ہو چکی ہیں، جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا گیا ہے اور تمہارے مٹانے سے مٹ نہیں سکتیں۔'' خاص امر یہ بھی قابل غور ہے کہ ایسی بہت احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سلمان فارسی کی قوم سے ایک شخص پیدا ہوگا جو علم خواہ ثریٰ میں ہو یا ثریا میں لے آئے گا اور آیہ: ''واخرین منهم لما یلحقوا بهم'' (۲۸/۱۱) کا مصداق اسی امام منتظر کو ٹھہرایا گیا جو فارسی الاصل ہوگا۔ انہی احادیث کی بنا پر ایران میں کئی مدعیانِ نبوت اٹھے اور مارے گئے۔ ہمارے زمانہ میں جناب بہاء اللہ بھی اپنی رسالت کی تائید میں یہی پیش کرتا ہے حالانکہ سلمان ''فارسی'' کی شخصیت ہی ایک فرضی افسانہ ہے جو ان حضرات کی اختراع ہے۔

چونکہ ہم نے اس موضوع پر بحث علیحدہ کی ہے۔ اس لیے اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ تصوف کو یونانی فلسفہ سے ایک تحریکِ عقلیات ملی اور مفید ثابت ہوئی۔ لیکن ''زندقہ'' نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

جب ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تو یہاں کے جوگیوں اور تپسویوں اور ویدانتوں کے عقائد سے بھی واقفیت ہو گئی۔ ایران اور ہندوستان دو ہمسایہ ممالک ہیں اور دونوں میں آریہ نسل کے لوگ آباد ہیں اور دونوں کی ذہنیت ملتی جلتی ہے۔ زندقہ کو ہندوستانی ویدانت اور جو لوگ سے بھی مزید تقویت ملی جس کو تصوف کے اذکار و اشغال میں داخل کیا گیا۔ بالخصوص ''پرانایام'' یا ''حبس دم'' اور لطائف ستہ وغیرہ، جن کا مذکور مناسب مقام پر کیا جائے گا، طریقت کا جزو لاینفک بن گئے۔ شہزادہ داراشکوہ تو اس کا

Marfat.com

بڑا معتقد تھا۔ اپنی تصانیف میں لکھتا ہے کہ قرآن میں ''کتاب مکنون '' سے مراد ''اُپنشد'' ہی ہیں۔ شہزادہ صاحب حضرت میاں میر لاہوری کے مرید تھے۔ رسالہ ''حق نما'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ میاں صاحب کے مرید بازاروں کے شوروغل میں ذکر ''سلطان الاذکار'' کرتے۔ ان کے ذکر کی آواز بازاری غوغا پر بلند رہتی ہے۔

یہ واقعات ہم اس لیے نمایاں کررہے ہیں کہ طالبانِ حق کو حقیقی تصوف کے فہم میں مغالطہ نہ ہو اور یہ سمجھنے میں دقت نہ ہو کہ ایسی باتیں جن کا نام ونشان سلف صالحین کے احوال واقوال میں نہیں ملتا، کہاں سے آ گئیں؟ اب جب کہ موجود ہیں تو ان کی اصل کیا ہے؟ اور کس حد تک تصوفِ حقہ یا اسلامیہ میں قابلِ برداشت ہیں؟ اس مختصر تشریح کے بعد جو فہم وتفہیم کے لیے کافی ہے، ہم ''تصوف'' کے سلسلہ کو جہاں تبع تابعین تک چھوڑا تھا، پھر جاری رکھتے ہیں۔

دورِ اوّل حضرت ابو یزید بسطامیؒ پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کی وفات ۲۶۱ھ میں اور بعض روایات کے مطابق ۲۳۳ھ میں ہوئی۔ اس دَور میں اکابر صوفیہ کرام گزرے ہیں، جن کا تذکرہ ہر ایک تذکرہ نویس نے کیا ہے اور عام مؤرخین نے بھی ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں سے شیخ سعدیؒ اور شیخ عطارؒ اور علی ہجویریؒ اور مولانا جامیؒ کی کتابیں تو پاکستان میں ہر ایک کتب فروش سے مل سکتی ہیں مگر میرے مطالعہ میں ایسی کتابیں بھی آ چکی ہیں جو اب نایاب ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹ گیا اور میرا کتب خانہ جس میں یہ سب کتابیں بھی تھیں، ضائع ہو گیا۔

دورِ اوّل کے صوفیہ کرام میں ذوالنون مصریؒ (متوفی ۱۴۵ھ) اور حسن بصریؒ اور رابعہ بصریؒ، مالک بن دینارؒ اور محمد واسعؒ اور حبیب عجمیؒ اور ابو عتبہؒ اور ابرہیم بن ادھمؒ (متوفی ۱۷۱ھ) معروف کرخیؒ (۲۰۰ھ) اور احد خضرویہ (۲۴۰ھ) اور سری سقطیؒ (۲۵۳ھ) وغیرہم، مشاہیر صوفیہ ہیں۔ حضرت ذوالنون نے ''موطا'' امام مالک سے خود سبقاً سنا اور خود بھی فقہ مالکی کا بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کی نسبت کہتے ہیں کہ مصری کتبوں کو پڑھا کرتے تھے۔ جو آج ایک علم (Egypliology) ہے۔ افسوس ہے کہ ان اکابر صوفیہ میں ایک بھی صاحب تصنیف نہیں۔ اگر کسی نے کچھ لکھا ہوتا تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ''زندقہ'' اس میں کیا کچھ تحریف کرتے اور ہمیں کس مسخ شدہ صورت میں ملتا۔ ان

حضرات کی یہ عادت تھی کہ جو کچھ بتاتے زبانی ارشاد فرماتے اور شاگرد مفہوم ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ غرض ارشادات ازبر کرنا نہ تھی بلکہ عملی جامہ پہنانا تھی۔ روایت یہ بھی ہے کہ جس نے سب سے پہلے ارشادات کو عبادات میں بیان کیا وہ حضرت ذوالنون مصری تھے۔ لیکن یہ بھی پریشان اقوال ہیں جو ہم تک پہنچتے ہیں۔ البتہ دور دوم میں سید الطائفہ جنید بغدادیؒ نے علم تصوف شرح و بسط سے بیان کرنا شروع کیا۔ لیکن یہ بھی ارادت مندوں کے حلقہ تک ہی محدود رہا۔ آپ کے مرید اور خلیفہ شبلی نے برسر منبر یہی باتیں کہیں۔ ان سے روایت ہے کہ میرا اور منصور کا ایک ہی مشرب تھا مگر مجھے تو دیوانہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور منصور بہت بڑا عالم اور صاحب تصانیف تھا، بچ نہ سکا۔

دورِ دوم میں بھی بہت بلند مرتبہ صوفیہ کرام گزرے ہیں۔ یہ دور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دَور میں ابو محمد سہیل بن تستری کا شمار صوفیہ اور علماء اسلام میں بھی ہوتا ہے۔ حضرت جنیدؒ اور وہ ایک ہی وقت میں تھے۔ اسّی سال کی عمر میں وفات محرم ۲۸۴ھ میں ہوئی۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ ''بدبختی کا نشان کیا ہے؟'' کہا کہ ''یہ ہے کہ تجھے علم دیا گیا مگر عمل کی توفیق نہ ہوئی اور اگر عمل کی توفیق بھی ہوئی تو اُس میں اخلاص نہ ہوا۔'' ہمارے موضوع کا مقصد ان بزرگوں کے احوال و اقوال کا تذکرہ نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے سوانح حیات اور ارشادات سے تصوف کی حقیقت کماحقہ واضح ہوتی ہے لیکن اگر کسی کو اس کی طلب ہو تو تذکروں میں دیکھ سکتا ہے۔ سردست ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر ایک دور میں تصوف کو ان بزرگوں نے کس علمی و عملی صورت میں پیش کیا اور یہ کہ اس پر دیگر اقوام کے فلسفہ کا اثر کیا ہوا۔ دورِ سوم میں جو شبلیؒ اور حسین منصور سے شروع ہوتا ہے، تصوف کی اشاعت عام ہو گئی اور وہ باتیں جو پیرانِ طریقت اپنے مریدانِ بااخلاص کے حلقوں میں بیان کرتے، اب برسر منبر کہنے لگے۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ صوفیہ محققین کے بھی بہت فرقے تھے اور فرقوں سے مراد ہماری وہ نظریے ہیں جن میں اختلاف ہے۔ لیکن ان کے اختلاف میں کبھی شر پیدا نہیں ہوا۔

''دو عاقل را نباشد لیکن و پیکار''

صوفیوں کے چار سلسلوں سے تو ہمارے ہندوستانی اور پاکستانی بھی واقف ہیں اور ہم بیان کر آئے ہیں کہ ان میں سے چشتیہ حضرات کو خاص کامیابی ہوئی۔ میں نے ان حضرات کے اکابر کے اقوال اور بعض تصانیف کا مطالعہ بھی کیا۔ مجھے تو نظریہ میں بھی اختلاف معلوم نہ ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی ایک نہ ایک صاحب سلسلہ سے لوگوں نے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ چشتیہ خاندان کے بانی حضرت ابو اسحٰق شامی چشتی ہیں۔ اسی طرح قادریہ خاندان کی ابتدا سیدنا شیخ عبد القادر محی الدین جیلانی سے ہوئی۔ حضرت شیخ جیلانی کی مشہور کتاب ''غنیۃ الطالبین'' کا مطالعہ کرو تو واضح ہوگا کہ وہی ارشادات ہیں جو خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہٗ کے اقوال میں ملتے ہیں۔ خواجہ نقشبند ممدوح فرماتے ہیں کہ ''میرا طریقہ عروۃ الوثقیٰ ہے اور یہ متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور صحابہ کرامؓ کے قدم پر چلنا ہے اور اس طریقہ میں تھوڑا عمل بھی بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔ لیکن متابعت سنت کی رعایت بہت بڑا کام ہے۔ جو بھی ہمارے طریقہ سے روگردان ہوگا اس کے دین میں خلل عظیم واقع ہونے کا خطرہ ہے۔ کلمہ ''لا الہ'' کے معنی ہیں اُن خداؤں کی نفی جو نفس انسانی میں باتباع مواد ہوس رچے ہوئے ہیں۔ اور ''الا اللہ'' اثبات وجود حق جل جلالہٗ اور ''محمد رسول اللہ'' سے مراد وہ مقام ہے جو متابعت رسول ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف اشارہ آیہ:

''قل ان کنتم یحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ، یغفر لکم وذنوبکم واللہ غفور رحیم، قل اطیعوا اللہ والرسول وان تولوا فان اللہ لا یحب الکفرین'' (پارہ ۳ رکوع ۱۳)

''اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور تمہاری خطائیں معاف فرمائے گا اور اللہ غفور اور رحیم ہے۔ کہو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اگر تم روگردان ہوتے ہو تو اللہ منکروں سے محبت نہیں فرمایا کرتا۔'' لوگ چاہتے تو ہیں کہ اللہ ان سے محبت کرے لیکن نہیں جانتے کہ صحیح طریقہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کا کیا ہے۔ یہ صحیح طریقہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں کہ جس طرح میں اللہ سے محبت کرتا ہوں، تم بھی کرو۔ یعنی پہلے ان خداؤں اور معبودوں کی نفی کرو جن کو کہ تم پوجتے ہو، پھر ایک اللہ کی عبادت کرو۔ خالص، بلا شائبہ شرک۔ حقیقت میں کلمہ

توحید اور حقیقتِ کلمہ یہ ہے کہ جب دل سے زبان پر آئے تو ماسویٰ بالکل فنا ہو جائے۔ یہ ضرور نہیں کہ کلمہ توحید کی بار بار طوطے کی طرح رٹ لگائی جائے۔ کسی شخص نے خواجہ نقشبند سے کرامت کی درخواست کی۔ فرمایا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہو گی کہ زمین ہمارے بار گناہ سے لدی ہوئی ہے اور ہم اس پر زندہ پھر رہے ہیں۔

کسی نے حضرت ابوسعید ابوالخیر سے دریافت کیا کہ آپ کے جنازے کے آگے کیا آیت پڑھی جائے۔ کہا کہ آیت اور آیات کا پڑھنا تو بہت بڑی بات ہے، یہ شعر پڑھنا:

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار
دوست رسد نزد دوست یار بنزدیک یار

خواجہ نقشبند کی وفات ماہِ ربیع الاول ۷۷۰ھ میں ہوئی۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیہ کرام متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی حقیقت تصوف سمجھتے تھے اور تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی طرف باتباع سنت نبوی متوجہ رہے۔ آج جو اذکار اور اشغال رائج ہو چکے ہیں، ان کی کوئی سند ان حضرات کے حالات اور اقوال میں نہیں ملتی اور ہم بیان کر آئے ہیں کہ یہ ہمسایہ اقوام سے لیے گئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر ایک ہندو تپسوی ''اوم'' کا ذکر کرتا ہے تو یہ ''اللہ'' کا۔ اور حبس دم وغیرہ تو خاص شغل ہندو سادھوؤں کا ہے۔ بظاہر اس میں کچھ قباحت نہیں اگر یہ مفید ہو تو آخر علم ہے۔ اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود یہ سب ذکر و شغل کرتا رہا ہوں اور میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے کوئی ذکر و شغل ایک دو دن سے زیادہ نہ کرنے دیا۔ میں نے ایک بار عرض کیا کہ ''بابا جی کسی ایک شغل کو تو تمام ہونے دیں۔'' فرمایا، ''بیٹا میرا مقصد یہ نہیں کہ تم ان اشغال میں وقت ضائع کرو۔ لیکن تمہارا ان سے واقف ہونا اس لیے ضرور ہے کہ کسی وقت یہ وہم نہ ہو کہ یہ بھی کوئی بڑی چیز ہے۔ اصل ذکر اور اصل شغل توحید ہے اور بس یادِ خدا سے بڑھ کر اور کوئی نہ ذکر ہے اور نہ شغل۔'' مناسب مقام پر اس موضوع پر بحث کی جائے گی۔ ایک دفعہ میرے ایک دوست نے خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ایک مکتوب بنام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قلمی خوشخط لکھا ہوا مطالعہ کے لیے دیا۔ اس میں خواجہ بزرگ ایک خاص ''شغل'' کی تشریح

Marfat.com

فرماتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''یہ عظیم الشان شغل ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں فرماتے رہے اور ان پر جبرئیل فرشتہ ظاہر ہوا اور مجھے خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شغل تعلیم فرمایا۔ وہ اس طرح کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پیر طریقت خواجہ عثمان ہارونی نے مجھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ فرزند اس لائق ہے کہ آپ اس پر نظر عنایت فرمائیں۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ شغل تلقین فرمایا اور کہا کہ اسی شغل کے دوران میں مجھ پر وحی نازل ہونے لگی۔ کتنی اہمیت اس شغل کی ہے۔ لیکن ''شغل'' کیا ہے جوگ شاستر سے سرقہ کیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ رگوں اور پٹھوں کے نام سب سنسکرت زبان کے الفاظ ہیں۔ عربی میں اگر یہ الفاظ ہوتے تو شاید میں بھی دھوکا کھا جاتا۔

یہ شغل حسب ارشاد ''باباجی'' میں نے بھی چند روز کیا اور آخر حسب الارشاد ''باباجی'' چھوڑنا پڑا۔

''پرانا اوم'' کا حبس دم بلاشبہ(۱) مفید حق ہے۔ یہ تو آج ہر ایک طالب جانتا ہے کہ ''آکسیجن'' اور ''ہائیڈروجن'' زندگی کے لیے مقدم شے ہے اور اسی سے خون صاف ہوتا ہے۔ اس لیے حبس دم کا نتیجہ ظاہر ہے کہ صحت پر اس کا اثر مخالف کتنا ہوگا۔ مگر ''عادت'' عجیب شے ہے جو لوگ اس شغل میں پڑتے ہیں وہ بتدریج دم بند رکھنے کی مشق کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے کہ جس طرح بعض اشخاص کو افیون اور ''سنکھیا'' کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ بھی بتدریج اس کی مقدار زیادہ کرتے رہتے ہیں اور

---

(۱) حبس دم کا رواج اگرچہ ہندو تپسویوں میں عام تھا اور اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا مگر یہ لوگ اس کے مخترع نہیں ہیں۔ اس کا سراغ مصریوں میں بھی ملتا ہے۔ اور یہود و مسیحی رہبان اس سے واقف تھے۔ بعض محققین کی یہ تحقیق ہے کہ خود مسیحؑ بھی یہ فن جانتے تھے۔ چونکہ حبس دم کی مشق اگر ساتویں درجہ تک کی جائے تو صاحب فن کی حالت (trance) ایسی ہو جاتی ہے کہ اس پر مردنی سی چھا جاتی ہے۔ اس سے آیہ ''ولکن شبہ لھم'' کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ مسیحؑ کی حالت صلیب پر مُردوں سے ملتی جلتی ہوگئی تھی۔ حالانکہ آپؑ زندہ تھے اور مردہ سمجھ کر صلیب سے اتارے گئے۔ ''دم عیسیٰ'' مشہور ہے اس میں بھی اسی حبس دم کا کرشمہ پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ دس آدمی ہلاک کرنے کے لیے ان کی روزانہ خوراک ہوتی ہے۔ ''پرایانام'' میں بھی نشہ کی کیفیت ہوتی ہے اور حرارت عزیزی بڑھ جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تپ چڑھ گئی۔ اس لیے اس کا شغل پانی میں بیٹھ کر عموماً کیا جاتا ہے۔ ''حبس دم'' کا اصل مقصد ''توجہ'' قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ تو ہر ایک شخص نے محسوس کیا ہوگا کہ جب کوئی شے اچانک ہماری ''توجہ'' کی جاذب ہوتی ہے تو سانس فوراً رک جاتا ہے۔ اس مشاہدہ نے حبس دم کی طرف رہنمائی کی اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ جب بخار کا جوش ہو تو بیمار ''ہذیان'' میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کو وہ کچھ نظر آتا ہے جو پاس بیٹھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ یہی کیفیت فاقہ کشی سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل ''نکات'' میں لکھتے ہیں کہ:

''از فرط گرسنگی کہ حرارت عزیزی بوداع قوی دامن می چنید، صاحب ریاضت اشکال غریبہ می بیند، یعنی بخارات کہ مادہ متخیلہ است ہرگاہ بدماغ صعود می نماید بمثالہائے عالم خواب درعین بیداری نقاب می کشاید۔ ہمچناں ہنگام نزع نیز صور مثالی برطبائع منکشف می گردد۔ وآں از باقیات خیال است۔ وگرنہ در نفس الامر تحقیق آں دشوار است ومحال۔ مثل شعلہ چراغ کہ چوں روغنش کم می گردد سراپا درمی گیرد۔ دروشن تر می شود۔ تاباندک فرصتے بمیرد۔ چوں غلبہ جوع کہ موجد صفرا است وغلبہ صفرا مادہ ایجاد سودا، جمعے را کہ بامبداء توجہے است۔ از صعود ایں بخارہا سطور حقایق و معانی خوانند وفرقہ را کہ از حقیقت بے خبریست۔ اشکال دیو ودومی دانند۔ چہ دودہا کہ ازیں آتش نامشتعل متصاعد نہ گردید، وچہ سوداہا کہ ازیں صفرائی سوختہ نرسید۔ اگر ہوش است باید فہمید کہ غیر از اشیائے محسوسہ معین ہرچہ درخیال پرتو اندازد۔ ہمہ سودا است وخلاف قاعدہ آنچہ در نظر ہا تشکل باید ہمہ صفرا۔

خلقے است دریں جنوں سرائی نیرنگ
زندانی اختراع چندیں فرہنگ
من بندۂ آں کہ در ادب گاہ ثبات
جوشش مجنوں نسازد وسیری رنگ

اس مقالہ میں اگر ہم یونانی اور ایرانی علوم کے تاثرات پر تفصیلی بحث کریں تو اصل موضوع سے دور جا پڑیں گے۔ مناسب مقامات پر تشریح کی جائے گی۔ اس مقام پر

Marfat.com

اتنا اشارہ کافی ہے کہ انہی تاثرات کے تحت تصوف نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی۔ مزید بحث مناسب مقام پر کی جائے گی۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ قرآن کا مطالبہ مومنین سے ایمان اور عمل صالح کا ہے اور اس ایمان اور عمل کی پوری شان صحابہ کرام کے وقت ہی نظر آتی ہے۔ تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں تصوف ان بزرگوں کی عملی زندگی تھی۔ لیکن علم ''دین'' تابعین ہی کے زمانہ میں ''علم فقہ'' اور ''علم کلام'' اور علم تصوف میں تقسیم ہونے لگا اور رفتہ رفتہ علم دین کی یہ تینوں شاخیں مستقل علوم میں رونما ہوئیں۔ بعض حضرات کے نزدیک علم دین ''الٰہیات'' اور ''نبویات'' اور ''سمعیات'' پر مشتمل ہے۔ ''الٰہیات'' میں تو ہستی حق تعالیٰ اور اس کے اسماء و صفات کی بحث ہے۔ ''نبویات'' میں انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں گفتگو ہے۔ اور ''سمعیات'' میں وہ امور ہیں جو صرف ''سمع'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حشر و نشر جنت و جہنم۔ تصوف میں چار درجات تکمیل دین کے تسلیم کیے گئے ہیں۔ (۱) شریعت، (۲) طریقت، (۳) معرفت، (۴) حقیقت۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو شریعت سے مراد تو وہی فقہی مسائل ہیں جو زیادہ تر اجتہادات ائمہ دین ہیں اور طریقت سے مراد وہ روش یا ملت ہے جو سلف صالحین نے عملاً دین میں اختیار کی۔ اس کی ذیل میں تمام وظائف اور اوراد اور ذکر و شغل آ جاتے ہیں اور ہر ایک طالب صادق پر واجب ہے جو کچھ اس کا پیر طریقت تلقین کرے، بلاچوں و چرا تعمیل کرے۔ حافظ کہتا ہے کہ:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہِ و رسم منزلہا

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ''راہ و رسم منزل'' سے جو شخص واقف ہے وہی منزل کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ جو شخص اس راہ میں قدم رکھتا ہے وہ تو واقف ہی نہیں کہ منزل کتنی دور ہے اور منزل تک پہنچنے میں کیا کیا مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں اور کیا کچھ ہر ایک مرحلہ پر پیش آئے گا۔ اس لیے خیر اسی میں ہے کہ رہنما کے اشاروں پر چلے۔ حافظ کہتا ہے کہ:

قطع ایں مرحلہ بے ہمرہی خضر مکن!
ظلمات است و بترس از خطر گمراہی

Marfat.com

نیز ارشاد ہے کہ:

یا بنہ برخود کہ مقصد گم کنی یا منہ پا اندریں رہ بے دلیل (حافظؒ)

اور کیا اچھا کہا ہے کہ:

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی (حافظؒ)

اس مرحلہ طریقت میں مرید کو خلوص دل سے شیخ طریقت کے ارشادات پر عمل کرنا چاہیے اور اس حد تک اپنے فہم و عقل کو شیخ کے تابع کرنا چاہیے کہ اپنی ہستی کو بھول جائے۔ بلکہ بعض اکابر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

قبلہ خوانم یا پیمبر یا خدا یا کعبہ ات
اصطلاح شوق بسیار است و من دیوانہ ام
(بیدلؒ)

اس ابجد خوانی میں سب کچھ جائز ہے جو شیخ طریقت جائز کہے۔

''کفریے کہ باسلام رسانہ عین اسلام است''

اس کو اصطلاحِ تصوف میں ''کفر'' اور ''بت پرستی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور طرف توجہ بت پرستی ہے، خواہ یہ شیخ طریقت ہو یا رسول خدا ہو۔ خسرو کہتا ہے کہ:

کافر عشقم سلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کند باخلق عالم کار نیست

شیخ طریقت کو لسان قرآن میں ''اولی الامر'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی اطاعت فرض ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اصل ''مطاع'' حق تعالیٰ ہے اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت بالتبع ہے۔ شیخ ابوالحسن خرقانی قدس سرہٗ کا واقعہ مشہور ہے کہ سلطان محمود غزنوی آپ کی زیارت کے لیے آیا۔ ایاز کو تو سلطانی لباس پہنا دیا اور خود ایاز کا لباس پہن لیا۔ جب دونوں شیخ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو شیخ مراسم تعظیم و تکریم بجا نہ

Marfat.com

لایا۔ سلطان نے جو ایاز کے لباس میں تھا کہا کہ ''شیخ سلطان آپ کی زیارت کے لیے آیا اور اولی الامر کا احترام واجب ہے۔'' شیخ نے کہا کہ ''ہاں ضرور ہے مگر یہ فقیر حق تعالیٰ سے اتنا مشغول ہے کہ رسول سے بھی شرمندہ ہے۔ اور اولی الامر تو تیسرے درجہ میں ہے۔ اتنی فرصت نہیں کہ ادھر توجہ ہو۔'' سلطان نے عذر و معذرت کی اور جب رخصت ہونے لگا تو شیخ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ ''تم شاہانہ غرور کے ساتھ آئے تھے اور اب انکسار فقر کے ساتھ جا رہے ہو۔''

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اپنے بیٹے کو مراتب سلوک کی تعلیم کرنے لگا تو اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے اس کے سینے کو ملنا شروع کیا۔ بیٹے نے کہا کہ ''ابا جی، میں حافظ قرآن ہوں۔ قرآن میرے سینے میں ہے۔'' فرمایا، ''ہاں، اسی لیے مل رہا ہوں کہ یہ عُجب جو تیرے سینے میں ہے کہ میں حافظ قرآن ہوں، محو ہو جائے۔''

حضرت موسیٰؑ کا قصہ مشہور ہے کہ آپ کی پرورش شاہی محل میں ہوئی۔ دستور یہ تھا کہ امرا و وزرا شاہی خاندان کے لڑکوں کی تربیت صوبوں کے اعلیٰ حاکموں کی زیر نگرانی ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ ''مجمع البحرین'' کے حاکم کے حصہ میں آئے۔ یہ وہ صوبہ تھا جو دریائے نیل کی انتہائی شرقی شاخ (پلوزیم) کے ساتھ اور بحیرہ روم کے اتصال تک واقع تھا۔ حاکم نے بھانپ لیا کہ نوجوان موسیٰؑ ہونہار ہے، مگر طبیعت جلد مشتعل ہو جاتی ہے اور اسے ضرورت ضبط نفس اور تحمل اور صبر کی ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں کروں اعتراض نہ کرنا اور خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ حضرت موسیٰؑ رہ نہ سکے۔ باوجود پختہ عہد تینوں دفعہ اعتراض جڑ ہی دیا۔ استاد نے جو کچھ سمجھانا تھا سمجھا دیا اور رخصت کیا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ جب تک طالب حق زیر تعلیم و تربیت ہو، شیخ کے ارشادات کی تعمیل بلا چوں و چرا کرے۔

طالب صادق ابتدائی مراحل سلوک میں شریعت کا سختی سے پابند ہونا چاہیے اور حقیقت یہی ہے کہ شریعت جس سے مراد ظاہر مراسم عبادات اور معاملات با خلق خدا ہیں، تصوف کا جزو لاینفک ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے اسے کسی نہ کسی صورت میں اپنے اعمال کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ چونکہ صوفیہ میں بعض فرقے ایسے بھی ہیں جو احکام شریعت کے کچھ بہت پابند نہیں یا بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت جیسی کہ سلف

Marfat.com

صالحین کے نزدیک مسلم تھی، ان پر واضح نہیں ہوئی۔ مولانا جامیؒ ''نفحات الانس'' میں ''صوفی'' اور ''متصوف'' اور ''ملامتی'' اور ''فقیر'' اور ''زہاد'' کی معرفت کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ لوگ جو رسوم شریعت کے پابند نہیں کہتے ہیں کہ ''احکام شریعت عوام کا وظیفہ ہے اس لیے کہ عوام کی نظر ظاہر اشیاء پر ہی ہوتی ہے اور یہی ان کا مقصود ہوتا ہے، لیکن خواص اور اہل حقیقت کا حال ان سے اعلیٰ وارفع ہے۔ اس طایفہ کو ''باطنیہ'' اور ''مباحیہ'' کہتے ہیں۔ لیکن ایک طایفہ اور بھی ہے جن کو ''مجذوب'' کہتے ہیں، وہ بھی احکام شرع کے پابند نہیں ہیں۔ یہ ''اصحابِ سکر'' ہیں، اس لیے صوم وصلوٰۃ ان پر فرض نہیں اور معذور بھی ہیں۔ اور ایک طایفہ وہ ہے کہ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ بحر فنا میں ان کو کلی استغراق اور عین توحید میں استہلاک حاصل ہے اور اپنے حرکات وسکنات کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ ہماری حرکات دروازہ کی حرکات ہیں جو بے محرک ممکن نہیں۔ اگرچہ معناً یہ صحیح ہے مگر یہ صرف اس جماعت کا قال ہی قال ہے حال نہیں۔ ان کی غرض اور مقصد تو اس دعویٰ سے اتنا ہی ہے کہ جو بھی خواہش نفس ہو اس کی تکمیل ہوتی جائے اور اعتراض بھی نہ ہو۔ اس طایفہ کو ''زنادقہ'' کہتے ہیں۔ حضرت سہل عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا فعل ارادت حق سے وہی نسبت رکھتا ہے جو دروازہ کی حرکت کو محرک سے ہے۔ اگر ایسا شخص اصول شریعت کی مراعات اور احکام عبودیت کے حدود کی محافظت بھی کرتا ہے تو وہ ''صدیقوں'' کے زمرہ میں ہے اور اگر مخالفت احکام شرع میں بے باک ہے اور یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ اپنے افعال کا ذمہ دار تو حق سبحانہٗ کو ٹھہرائے اور اپنے نفس سے ملامت دور کرے تو ایسا شخص ''زندیق'' ہے۔ ایک اور طایفہ بھی ہے جس کو ''قلندریہ'' کہتے ہیں۔ وہ صرف فرائض کی ادائیگی کافی سمجھتے ہیں اور ان کا وقت زیادہ تر صفائی باطن پر صرف ہوتا ہے۔ حافظ کہتا ہے کہ:

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست　　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

عراقی کہتا ہے کہ:

صنما رہ قلندر سزدار بمن نمائی　　　کہ دراز و دور بینم رہ ورسم پارسائی

مولانا جامی کہتے ہیں کہ ''ہمارے زمانہ میں بھی ایک جماعت اپنے آپ کو قلندر کہتی ہے۔ مگر قلندر کا نام ان پر عاریت ہے۔ ان کو 'حشویہ' کہتے ہیں۔ اسی طرح اور

Marfat.com

بھی طایفہ ہیں جن کا مذکور اس مقام پر بے فائدہ ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ 'زندیق' وہ گبر ہیں جو مسلمانوں کے لباس میں مسلمانوں کو اپنے عقائد باطلہ سے گمراہ کرتے رہے اور یہ طایفے جن کا مذکور ہوا انہی کے تخم فساد کی پیداوار ہیں۔ ان کو تصوف اور صوفی سے دور کی نسبت بھی نہیں۔''

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس نباید او در ہر دست دست

اصول اور احکام شریعت کے متعلق نامناسب نہ ہوگا کہ اگر ہم یہ کہیں کہ ائمہ دین نے جو بھی وضع کیے ہیں وہ ان کے اپنے زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کے بالکل مناسب تھے اور یہ سب اجتہادات وقتی ہی تھے۔ چنانچہ ایک محقق نے پتہ کی بات ہی ہے کہ ''گر بوحنیفہ در زمان مابودے فقہ دیگر می نوشت۔'' احکام حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات بے شمار اور ہمیشہ بدلتے ہیں اس لیے ضرور ہے کہ احکام بھی حالات کے ساتھ بدلیں۔ چونکہ مسلمانوں پر ذہنی جمود چھا چکا تھا اس لیے وہ رجعت پسند ہو گئے اور جو کچھ ائمہ دین نے اجتہاد فرمایا اس پرانی لکیر کو پیٹتے آ رہے ہیں۔ اصولی احکام سات ہیں۔ (''سبعاً من المثانی '') اس موضوع پر ہم نے علیحدہ بحث مفصل کی ہے۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ اصولی احکام قرآن میں مذکور ہیں اور تمام اقوام کی شریعت اور آئین وقوانین کی بنیاد ہیں۔ مثلاً امر توحید و نہی شرک اور زنا اور سرقہ اور کذب کی نہی۔ امر حسن سلوک باخلق خدا وغیرہ۔ یہ اصولی احکام سردست زیر بحث نہیں ہیں۔ ان پر تو تمام اقوام مسلم و غیر مسلم کا ہمیشہ عمل رہا ہے اور رہے گا۔ مسائل اور بھی ہیں جو فقہا نے مدوّن کیے ہیں۔ بحث انہی میں ہے کہ وہ کہاں تک ہمارے زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب ہیں۔ اصولی احکام اور اصول احکام قرآن میں مکمل موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ایک زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کے تحت ہر ایک زمانہ میں فقہا احکام وضع کریں۔ جہاں تک تصوف کا تعلق ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل کہتا ہے کہ:

برصوم وصلوٰۃ بر می نفرا چیزے تعدیل بہر امر کمال عرفاست

ملائکہ کے دعویٰ کی نفی نہیں کی گئی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی حمد اور تقدیس میں مشغول رہتے ہیں اور نہ ملائکہ کے اس اعتراض کی نفی کی گئی ہے کہ آدم زاد مفسد اور خونریز

Marfat.com

بھی ہو گا۔ اگر محض حمد و تقدیس ہی منشاء حق ہوتا تو آدم کو مسجود ملائکہ نہ بنایا جاتا۔ اس لیے ظاہر کہ تخلیق آدم میں کچھ اور بھی حکمت الٰہیہ ہے اور اس مقصد کی تکمیل آدمی کا فرض ہے۔ یہ بحث ''معرفت'' اور ''حقیقت'' کے تحت ہی مناسب ہے۔ شریعت صرف ہمارے اعمال کی صورت ہے اور اس صورت میں جو حقیقت رونما ہوتی ہے وہ ذکر الٰہی ہے۔ یعنی ہمارے اعمال لوجہ اللہ ہوں۔ ان میں خلوص اس حد تک ہو کہ ان میں ہماری ہوائی نفس کا دخل نہ ہو۔ یہ ہے حقیقی ''تصوف''۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان اعمال کے بغیر تو رہ نہیں سکتا، خواہ یہ اچھے ہوں یا برے۔ ان کی صورت اچھی ہی ہونی چاہیے۔ جو لوگ اعمالِ بد کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم نیک عمل بظاہر اس لیے نہیں کرتے کہ یہ ریا کاری ہے وہ جو نفس کے فریب میں الجھے ہوئے ہیں۔ مولانا جامیؒ ''نفحات'' میں کہتے ہیں کہ طایفہ ''ملامتیہ'' نیک عمل کرتے ہیں تو اس کے اخفا میں کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات خلاف شرع عمل بھی کرتے ہیں کہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہوں اور لوگ ان کو ملامت کریں۔ اس طرح ان کے نفس کی اصلاح ہوتی رہے۔ یہ لوگ محجوب ہیں اور ان پر اعمال کی غرض اور حکمت واضح نہیں ہوئی۔ وہ لوگوں سے اپنے اعمال صالح کو چھپاتے ہیں مگر اپنے نفس سے تو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ صوفی وہ ہے جو اپنے اعمال کو خلق سے پوشیدہ نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ اعمال صالح کی توفیق من جانب اللہ ہے اور اللہ کی نعمت کا اظہار نعمت کا شکر ہے اور یہ کہ کوئی عمل اللہ سے پوشیدہ نہیں خواہ در پردہ کیا جائے یا ظاہر۔ اس لیے عمل ایسا ہی ہونا چاہیے جو پسندیدہ ہو۔ جو لوگ مزعومہ آزادی کا دم بھرتے ہیں دراصل حیا شرم جو تقاضائے ایمان ہے، ترک کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک ''ملنگ'' شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ کے پاس آیا اور سوال کیا کہ افیون کھلاؤ۔ شاہ صاحب نے ایک روپیہ دیا اور کہا کہ ''بابا تمہارا اختیار ہے کہ افیون کھاؤ یا رزق پاکیزہ۔'' ملنگ نے کہا کہ ''اونچی دکان پھیکا پکوان۔ نام تو بہت سنا تھا اور یہ سمجھا کہ آپ آزاد آدمی ہیں، مگر معلوم ہوا کہ پابند رسم و رواج ہیں۔'' شاہ صاحب نے فرمایا، ''آپ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں؟ آپ بھی ایک وضع کے ایسے ہی پابند ہیں جیسا میں۔

بریدہ زہمہ باخدا گرفتار است   اقدام شد آزاد   کہ کرد قطع

Marfat.com

اگر ایسے ہی آزاد ہو تو آؤ وضو کرو اور میرے ساتھ نماز پڑھو۔"

جسے لوگ آزادی سے موسوم کرتے ہیں اگر دیکھا جائے تو بدترین پابندی میں گرفتار ہیں۔

بیدل کہتا ہے کہ یہ غافل اتنا نہیں جانتے کہ:

اے بہار نیستی از قدر خود شو باخبر　　ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

اور یہ کہ

"ایں (۱)　خاک چہ قدر و خونہا خوردہ تا نقش　بستہ است و ایں یک نفس نیم چہ مقدار در ضبط کوشیدہ تا بشکل حبابی پیوستہ۔"

جمعے از پیش خویش آگاہند　　برفلک رفتہ اندد در چاہند
ہمچو فرزیں کج خرامی جہل　　ہمعناں عزیمت شاہند
بسا نارساندہ ظرفِ فروغ　　طشت خورشید و ساغر ماہند
بحر پیمائی رشحہ شبنم　　کوہ پرواز و پرہٗ کاہند
تانگردند خاک جادہٗ شرع (۲)
گر ہمہ منزل اند گمراہند

مانا کہ رسوم شرع میں تکلف و تصنع محسوس ہوتا ہے مگر یہ عالم خود عالم صنعت ہے۔ اس لیے بقول محقق بے بدل مرزا بیدل، "در عالم ظہور انسان　انجام مراتب

---

(۱): ادارہ 'تخلیقات' اپنے معزز کرم فرماؤں سے معذرت خواہ ہے کہ خواجہ محمد عباداللہ اختر بی اے امرتسری کی وقیع کتاب "علم تصوف" کے دست یاب نسخہ میں سے کچھ الفاظ پڑھے نہیں جا سکے، اس لیے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ فاضل قارئین سے خصوصی التماس ہے کہ اگر صاف لکھائی والا نسخہ اُن کی دسترس میں ہو تو ازراہِ کرم خالی جگہوں پر الفاظ لکھ کر کتاب ادارہ کو روانہ کر دی جائے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی عمل میں لائی جا سکے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ قارئین علم پروری کا ثبوت دے کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

(۲)　یحییٰ بن معاذؒ کو کسی نے ایک شخص کی نسبت کہا کہ "وہ کہتا ہے کہ میں ایسے مقام تک پہنچ گیا ہوں کہ مجھے صوم و صلوٰۃ کی ضرورت نہیں۔" فرمایا، "یہ مقام تو صرف جہنم ہے۔"

Marfat.com

حقیقت بے تکلف بودن خجلت تحصیل کمال است و بے باعث تشویر و انفعال۔"

در صومعہ باید بہ تواضع بودن در مصطبہ سرخوش تجرع بودن
یعنی نقص حقیقت یکرنگی ایست در عالم صنع بے تصنع بودن

"طریقت" کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ سالک راہ و رسم منزل سے تو خود واقف نہیں ہوتا۔ اس لیے ضرور ہے کہ وہ کسی واقف راہ کو اپنا راہبر بنائے۔ ایک شخص نے مکہ معظّمہ دیکھا ہوا ہے۔ اگر وہ کسی ایسے شخص کو اس ارض مقدس کے حالات بتائے جس نے خود نہیں دیکھا تو اس کو یقین کرنا چاہیے لیکن یہ یقین بمنزلہ علم نہیں ہے جو عینی شاہد کو حاصل ہے۔ اور نہ وہ کیفیت صاحب یقین کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے جو شہادت اوّل کے لیے خاص ہے۔ اگر صاحب یقین مکہ معظّمہ کی نسبت کچھ بیان کرے گا تو اس کی شہادت ثانوی اور سماعی ہوگی اور اس پر وہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا جو شاہد اول کا حصہ ہوتی ہے۔ تصوف میں عینی شہادت ہی لائق اعتبار ہے۔ اس لیے شیخ عطارؒ کہتے ہیں کہ:

ہر کہ نادیدہ نامِ اُو گوید!
مشرک است آں فضولِ نا ہنجار

اور مولانا جامیؒ کہتے ہیں کہ:

از ساحت دل غبار کثرت رفتن خوشتر کہ بہرزہ دُر وحدت سفتن
مغرور سخن مشو کہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

اس لیے ارشادِ قرآن ہے کہ:

"قل هذا سبيلى ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعنى و سبحٰن الله وما انا من المشركين" (۱۲/۶)

"کہو کہ یہ ہے میرا طریق، اللہ کی طرف دعوت علی بصیرت دیتا ہوں، میں اور وہ بھی جو میرا اتباع کرتے ہیں اور سبحان اللہ، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

"والذين اذا ذكرو بأيٰت ربهم لم يخترو ا عليها صماً و عمياناً۔" (۱۹/۴)

"اور وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو ان کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں

تو وہ ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے (بلکہ علیٰ بصیرت قبول کرتے ہیں)۔"

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر تقلید علیٰ بصیرت نہ ہو تو وہ شرک ہے۔ مقلد آیات الٰہیہ قبول نہیں کرتا وہ تو صرف بیان کرنے والے کی شخصیت کا اتباع کر رہا ہے۔ اور اس کا امکان ہے کہ بیان کرنے والا خود شاہد نہ ہو یا بہ تقاضائے بشریت غلطی کرے۔ اس لیے یہی غلطی اگر اس پر یقین کیا جائے، گمراہ کن ثابت ہوگی۔

ملتے در علّتے علت شود   کفر گیرد کاملے ملت شود

تقلید علیٰ بصیرت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہر ایک مدعی ہدایت کی صداقت بھی پرکھی جا سکتی ہے اور طالب حق کے پاس معیارِ صداقت "شریعت" ہے۔ اگر دیکھے کہ پیر قطاع الطریق کا عمل خلاف شرع ہے تو ضرور ہے کہ وہ یا تو ایسے کسی طایفہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا مذکور ہو چکا ہے، اس لیے اقتدا کی صلاحیت نہیں رکھتا یا محض سنی سنائی باتیں بتاتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ:

حرف مرداں را بدزد در مردوں   تا بخواند بر سلیمے زاں فسوں

مرزا بیدل نے ایک قصے کے ضمن میں لکھا ہے کہ ایک شخص چند آدمیوں کے حلقہ میں اپنی سیر و سیاحت کی سرگزشت بیان کر رہا تھا۔ کچھ باتیں تو اس نے سیاحوں سے سنی ہوئی تھیں اور کچھ اپنی طرف سے بیان کرتا رہا۔ کسی نے پوچھا کہ فرمایئے مچھلی کی کیا صورت و شکل ہوتی ہے۔ میں نے تو آج تک دیکھی نہیں۔ اس سے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا سوال ہے۔ میں اکثر سمندروں کی سیر کر آیا ہوں اور یہی مچھلی میری خوراک تھی۔ لیکن چونکہ تم نے مچھلی کبھی دیکھی نہیں اس لیے اس کو اونٹ پر قیاس کر لو۔ اونٹ کے بھی دو سینگ سر پر ہوتے ہیں اور مچھلی کے بھی ہوتے ہیں۔

"بہ بین اشتر و ماہی ایجاد کن"

لوگ ہنسنے لگے کہ بحر و بر کی سیاحت محض لاف زنی ہے۔ مچھلی تو دیکھی نہیں، اونٹ بھی نہیں دیکھا۔

سب سے بڑا فائدہ ایک اور ہے، اسے ہم مرزا بیدل کے لفظوں میں بیان

کرتے ہیں:

''تجربہ کاران امتحان گاہ متفق اند، کہ خامہ تقدیر برصفحہ سیمائے ہر صاحب کمالے اثری نگاشتہ است۔ وسحاب بے نیازی در حدیقہ طبع ہر معنی نہالے قدرتی کاشتہ، بعضی ازاں جوہر اند، کہ دلہائے حاضراں را بصحبت شان بے اختیاری حزن درمی گیرد و بعض باں کیفیت کہ دماغ مستفیداں از مشاہدہ شان جز نشہ سرور نمی یزیرد۔ یکے از دلایل کمال تصرف است در مزاج غیر کردن۔ یعنی قوت استعداد و دیگرے ہم وضع خود بفعل آوردن۔ ازیں جاست کہ محاذی شعلۂ چراغ ہر سر انگشتے شمعی افروختہ و مقابل شعاع آفتاب برقطرہ آبے کلاہ زرینی دوختہ۔

ریشہ با آب چو ساز و گل احمر گردد
خاک چوں طالب خورشید شود زر گردد
صحبت صاف دلاں جوہر اکسیر غناست
بی صدف قطرہ محال است کہ گوہر گردد

اس حد طریقت تک تو اتباع شیخ ناگزیر امر ہے۔ اس کے بعد''معرفت''میں اتباع شرک ہے۔ تمام اکتشافات جب تک کہ قلب پر تذکر و تفکر سے ہوں وہ اس کے اپنے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ ''معرفت'' اصطلاح تصوف میں اور شے ہے اور''علم معرفت'' اور چیز ہے۔ تمام صوفیائے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ معرفت بے علم محال ہے اور علم بے معرفت وبال۔ لیکن معرفت امر وجدانی اور ذوقی ہے، نہ کہ قال۔

قال را بگذارد مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

چونکہ ''معرفت'' امر وجدانی ہے۔ تقریر اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن علم اس کا مقدمہ ہے، اس لیے ہم اس کے سوا اور کچھ بیان نہیں کر سکتے کہ اتنا بتا دیں کہ علم معرفت کیا ہے؟ تاکہ ہر ایک طالب حق کو کچھ مبادیات تصوف کا علم ہو۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب مسلمانوں کا اختلاط غیر مسلم اقوام سے دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا تو ان اقوام کے علوم و فنون سے بھی واقفیت ناگزیر امر تھا

چونکہ مسلمان علم دوست تھے، اس لیے عربی میں غیر اقوام بالخصوص یونانیوں کی علمی کتب کا ترجمہ کیا گیا۔ ان کے مطالعہ کے بعد ناممکن تھا کہ اثر پذیر نہ ہوتے۔ چونکہ یونانی فلسفہ میں زیادہ تر کائنات اور الٰہیات بحث کا موضوع تھا اور مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا ہی ''دین'' تھا، اس لیے عقائد پر اس کا گہرا اثر پڑا اور کئی فرقے جن کے عقائد میں اختلاف تھا، پیدا ہو گئے۔ لیکن ان میں سے کوئی فرقہ اصول دین کا منکر نہ تھا۔ وہ صفات الٰہیہ اور کائنات کے حقائق پر اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے بحث کرتے۔ بقول علامہ ابن خلدون، قرآن کی آیات ''متشابہات'' چونکہ تاویل کی محتاج ہیں، اس لیے ان آیات کی تاویل جو کچھ ان کے فہم میں آتا، کرتے۔ اس بحث میں استدلال عقلیہ کا بڑا دخل ہے جو علم منطق پر مبنی ہیں۔ یونانی ''سفسطہ'' (sophests) اس علم میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ چونکہ حکما اسلام نے بھی یہی روش اختیار کی اس لیے بعض اہل الرائے کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ''صوفی'' کا لفظ ''سفسطہ'' سے ماخوذ ہے۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ ایک مغالطہ ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ صوفیائے محققین نے یونانی فلسفہ کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کیا جو ''سوفسٹ'' استعمال کر رہے تھے۔ یعنی علم منطق، اور یہ امر ناگزیر امر تھا۔ اس طریق مجادلہ کو اصطلاح حکما اسلام میں ''علم الکلام'' کہتے ہیں۔ علم کلام کی تحریک چونکہ یونانی فلسفہ نے کی اس لیے ابتدا میں علماء اسلام اور طبقہ اولیٰ کے صوفیہ کرام اس کو بہت برا سمجھتے (۱) رہے۔ اور طالبان حق کو اس سے منع کرتے رہے۔ لیکن جب دیکھا کہ یہی حربہ مخالف فریق کو مغلوب کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوا ہے تو تمام اکابر کی توجہ اس طرف ہو گئی۔ حد ہے کہ امام فخر الدین رازیؒ نے ''تفسیر کبیر'' اسی رنگ میں لکھی۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) منطق اور فلسفہ کی مذمت اکابر اس حد تک کرتے کہ تیسری صدی ہجری میں امام شافعی اتنا تسلیم کرتے ہوئے کہ مدافعت دین کے لیے خاص خاص اشخاص کو علم کلام حاصل کرنا چاہیے مگر اس کی اشاعت عام نہ ہو۔ لیکن جو اسی کا دلدادہ ہو مناسب ہے کہ کھجور کی شاخوں سے اسے مضروب کیا جائے اور تمام قبائل میں اس کی تشہیر ہو کہ ایسے شخص کی یہ سزا ہے جو کتاب اور سنت سے پھر جائے۔ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جو شخص کلام سے علم حاصل کرنا چاہے وہ ''زندیق'' ہے۔

Marfat.com

گر بہ استدلال کار دیں بدے فخر رازی راز دار دیں بدے
پائے استدلالیاں چوبین بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

لیکن ''مثنوی معنوی'' شروع سے آخر تک پڑھ جاؤ، اس پر بھی علم کلام کے رنگ کی شوخیاں نمایاں ہیں۔ امام غزالی اور شیخ اکبرؒ، غرض تمام اکابر صوفیہ نے علم معرفت پر جو کچھ لکھا، علم کلام ہی کی مدد سے لکھا۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں علم کلام زندگی کے ہر ایک شعبہ پر چھایا ہوا تھا۔ فقہا کے اجتہادات اور علماء اور حکما کی بحث دَر بارہ عقائد اور بالخصوص تصوف میں بھی یہ علم نمایاں نظر آتا ہے۔ امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) نے یونانی فلسفہ کی تردید یونانی علم منطق سے کی اور اس مفکر نے بھانپ لیا تھا کہ ''تصوف'' ہی وہ علم ہے جو اغیار کے حملوں کی مدافعت کامیابی سے کرسکتا ہے۔ ''النسفی'' (متوفی ۵۳۷ھ) نے ''عقاید'' پر جو کچھ لکھا آج بھی دنیا اسلام میں مقبول ہے۔ علامہ سعد اللہ بن تفتازانی (۷۹۰۔۷۲۲ھ) نے عقاید کی شرح لکھی تو نہ صرف ''سفسطہ'' بلکہ ان اسلامی فرقوں کے نظریات کی بھی تردید کی ہے جو یونانی فلسفہ سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان میں سے ابتدائی فرقہ ''معتزلہ'' کا ہے اور واصل بن عطا سے منسوب ہے۔ یہ شخص حضرت حسن بصریؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ اختلافِ عقاید پر حضرت حسنؒ نے کہا کہ یہ ہم سے علیحدہ (عزل) ہو گیا اور اس کے متبعین کا نام معتزلہ مشہور ہو گیا۔ مگر یہ طایفہ اپنے آپ کو ''اہل العدل والتوحید'' کہتا، مگر مشہور اسی نام سے ہوا جو مخالف فریق نے تجویز کیا۔ خلافت عباسیہ میں معتزلہ کا زور رہا۔ اس لیے کہ ان ایام میں علم کلام بھی زوروں پر تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔ لیکن انہی میں سے شیخ ابوالحسن اشعری پیدا ہوا۔ ایک دن اس نے اپنے استاد ابوعلی جبائی سے دریافت کیا کہ ''تین بھائی ہیں۔ ایک تو مومن ہے اور اتباع دین کرتا ہے۔ دوسرا اتباع عملاً نہیں کرتا۔ تیسرا ابھی طفل ہے اور تینوں اسی حالت میں فوت ہو گئے۔ حشر میں ان سے کیا سلوک ہوگا۔'' معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ پر واجب ہے ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا و سزا دے۔ اس لیے جواب دیا کہ ''پہلا تو جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں۔ تیسرے نے چونکہ کوئی عمل نیک و بد نہیں کیا اس لیے نہ جنت میں اور نہ جہنم میں جائے گا۔'' ابوالحسن نے کہا کہ ''اگر طفل اللہ سے یہ کہے کہ یا اللہ مجھے تو نے عمر کیوں نہ دی کہ بڑا ہو کر نیک عمل کرتا اور آج جنت میں جاتا تو اللہ

Marfat.com

تعالیٰ یوں کہے گا کہ میں جانتا تھا کہ اگر تو بڑا ہوتا تو بُرے عمل ہی کرتا اور جہنم میں جاتا۔ اس لیے تیرے لیے یہی بہتر ہوا کہ تو طفولیت میں فوت ہو گیا۔ ابو الحسن نے کہا کہ اگر دوسرا بھائی بداعمال کرنے والا یہ کہے کہ "یا اللہ تو نے مجھے طفولیت میں کس لیے موت نہ دی کہ نہ بڑا ہوتا اور نہ بُرے عمل کرتا اور نہ جہنم میں آتا۔ اس کا کیا جواب ہے تو وہ بغلیں جھانکنے لگا اور ابو الحسن نے اعتزال سے توبہ کی اور اس کے بعد یہی اعلان کیا کہ جو کچھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع امت کا عمل شروع سے رہا ہے، وہی صحیح ہے۔ چنانچہ اس کے متبعین اہل السنّت والجماعت کہلائے۔ لیکن ردعمل ایک ہی وقت میں مصر اور دیگر مقامات پر شروع ہو چکا تھا۔

ابو جعفر احمد الطحاوی (متوفی ۳۳۱ھ) نے مصر میں عقاید پر امام ابو حنیفہ کے اتباع میں لکھا۔ اس نے "الاشعری" سے بھی کچھ اختلاف کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری اور پانچویں صدی میں عقاید نے ایک مستقل عقل کی صورت اختیار کر لی۔ امام غزالی نے "احیاء العلوم والدین" میں اس کو کمال تک پہنچا دیا اور ذات و صفات الٰہیہ اور رسالت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ لکھا وہ آج بھی مستند سمجھا جاتا ہے۔

ان تاثرات سے علم تصوف بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ ان ایام میں جو کچھ ذات و صفات الٰہیہ کے متعلق اشعری نے لکھا، وہی علم معرفت سے تعبیر ہوتا ہے۔ لیکن ہم واضح کر چکے ہیں کہ معرفت اور شے ہے اور علم معرفت اور چیز ہے۔ اگرچہ علم معرفت، معرفت کا مقدمہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نازک مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کوئی ایسا فقرہ نوک قلم سے نہ لکھا جائے کہ غلط فہمی کا موجب ہو۔ خود عارف رومی جو امثال سے اپنا ما فی الضمیر واضح کرنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

او بروں از عقل و قیل وقال دمن خاک بر فرق من و امثال من

شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ:

اے برتر از قیاس و گمان و خیال و وہم
وزہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ماہم چناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

Marfat.com

اکابر صوفیہ کرام نے جو بحث علم معرفت میں کی ہے وہ عام فہم نہیں، بلکہ ان علماء کے لیے بھی ٹھوکر کا باعث ہوئی جو تفقہ فی الدین کے مدعی ہیں۔ یہ اشارہ ہم اس مقالہ کے شروع میں کر چکے ہیں۔ میں نے جو کچھ ان کی کتب سے اخذ کیا اور بالخصوص اپنے شیخ طریقت کی صحبت میں سیکھا اس کا ملخص عام لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور تشریحاً اس پر جو کچھ اضافہ اپنی تحقیق سے کروں گا وہ میری ذاتی تحقیق ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے۔ علم معرفت جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں علم کلام کی صورت اختیار کر چکا تھا اور تصوف میں ایسی علمی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر تھا جو یا تو پہلے ہی علم کلام میں موجود تھیں یا ضرورتاً اکابر صوفیہ نے اختراع کیں۔ اگر ہم صرف ان اصطلاحات کی شرح کریں تو ایک دفتر درکار ہے اور ایک یہ وجہ بھی ہے کہ بعض علماء ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں اور غلط فہمی میں الجھ کر رہ گئے۔ میں حتی الوسع عام فہم الفاظ میں ان کے مطالب بیان کروں گا اور ضرورتاً ان کی تشریح بھی کی جائے گی۔

''علم معرفت'' میں مقدم فہم اس اصطلاح کا ضروری ہے کہ علم کی تعریف کیا ہے؟ امام غزالی کے نزدیک علم وہ ہے کہ معلوم اس طرح صاف صاف ممیّز ہو کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ ہو۔ مثلاً دو اور دو چار ہیں۔ اگر کوئی شخص لاکھ معجزے دکھائے اور کہے کہ دو اور دو تین ہیں تو گو مجھے تعجب ہو گا کہ اس اعجازیٔ کرشمہ کی حقیقت کیا ہے۔ لیکن یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ دو اور دو تین ہیں۔ لیکن یہ تعریف جامع نہیں۔ اور خود امام صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ اس اصل اصول تحقیق پر اگر کسی شے کو پرکھا جائے تو نہ تو حواس قابل اعتبار رہتے ہیں اور نہ عقل پر بھروسا ہو سکتا ہے، جو ذرائع علم ہیں۔ ''علم'' عین مطابقت کائنات خارجی کے نظام (۱) اور اس کے ذہنی تصور

(۱)

چیست علم اصل قدرت بیچوں — نظم جمعیت ظہور و بطوں
حسن مرآت عالم و معلوم — نور تمیز حاکم و محکوم
تانگیری زعلم خامہ بدست — صورت ہیچ چیز نتواں بست
غیر علم آنچہ کردہ اند رقم — ہست جز جہل و جہل جملہ عدم
نزد اہل حقیقت ایجاد — ہیچ چیزے بغیر علم نزاد
ہر چہ بینی زمفرد و ترکیب — دارد از علم جوہر ترتیب

''بیدلؔ''

Marfat.com

میں ہے۔ کائنات آفاقی یعنی وہ عالم جو ہم سے باہر ہے اور لسان قرآن میں عالم شہادت سے موسوم ہے اور مشخص اور معین ہے۔ ہر ایک انسان کے قلب میں اس کا تصور تاحد نظر موجود ہے۔ اگر یہ تصور اس کائنات کے عین مطابق ہے تو اس کا شعور علم سے موسوم ہوتا ہے۔ سردست یہ بحث کا موضوع نہیں کہ خود کائنات کیا ہے۔ آیات حقیقت ثانیہ ہے یا باطل ہے؟ جو کچھ بھی ہے اسی کا عکس یا نقش یا تصور ہمارے ذہن میں بالارادہ یا بلا ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ ہم ایک باغ کی روشوں پر ٹہل رہے ہیں۔ ہم نے کسی ایک درخت کی ایک شاخ کے پتوں کا بھی شمار نہیں کیا۔ لیکن ایک ہی نظر میں تمام باغ اور زمین و آسمان بلا ارادہ ہمارے قلب میں نقش ہو چکا ہے اور ایسا مستقل نقش ہے کہ ہم اسے محو بھی نہیں کر سکتے۔ خواب میں ہم یہی باغ اور اس کا ماحول اسی طرح دیکھیں گے جیسے بیداری میں ہماری نگاہ بے محابہ بلا ارادہ اور بلاشعور دیکھ چکی ہے۔ یہ تصور کسی ایک شخص کا وہم و خیال نہیں بلکہ ہر ایک شخص کا ہے۔ ہم دن کی روشنی اور رات کی تاریکی کا اختلاف مشاہدہ کرتے ہیں۔ دن کے وقت ہم فکر معاش میں لگ جاتے ہیں اور رات کے وقت آرام سے سو جاتے ہیں۔ یہ تقاضائے لیل و نہار نہ صرف ہر انسان بلکہ ہر ایک جاندار بھی محسوس کرتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لیے ہم دن کو دن اور رات کو رات اسی تقاضا اور دیگر امور متعلقہ کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ یہ حق ہے اور علم کی تعریف میں وہ تمام اُمور آجاتے ہیں جو حقیقت ثابتہ ہیں جن کا شعور ہمیں اپنی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔

(۲) انسان کا تعلق انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک تو کائنات اور دوسرا خالق کائنات سے ہے اور اسی تعلق کی معرفت پر اس کی ارتقائی یا پسندیدہ زندگی کا انحصار ہے۔ اس لیے انسان کو ایسے امور کا علم ہونا چاہیے جو ان تعلقات کو اس پر صاف صاف واضح کریں اور یہ کہ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کائنات میں اس کی ''حیثیت'' اور ''مقام'' کیا ہے۔ لیکن ان اُمور کا انکشاف نہیں ہوسکتا، جب تک اس کو اپنے ہی نفس کی معرفت نہ ہو۔ اسے اصطلاح میں ''خود شناسی'' کہتے ہیں۔ اس خود شناسی کے بعد وہ اپنے حقیقی مقام فی الکائنات کو پہچان لے گا تو کوشش بھی کرے گا کہ اس مقام تک اس کی رسائی ہو۔ اس کو اصطلاح میں ''بخود رسیدن'' کہتے ہیں۔ جب وہ اس مقام پر

متمکن ہو جائے تو خالق کائنات کو بھی تا حد نظر پہچان لے گا۔ اس لیے تمام صوفیہ محققین کا اتفاق ہے کہ: ''من عرف نفسه فقد عرف ربه''۔

مرزا بیدل رباعی میں کہتے ہیں:

اشیا عرض خیال دیدن بود است
اسما ہمہ افسانہ شنیدن بود است
ایں جملہ زخود بروں ودیدن بوداست
انسان گشتن بخود رسیدن بود است

☆☆☆☆

در وادیٔ عشق اگر دیدن باشد
ہر جادۂ غیر خط کشیدن باشد
ما و سفری کہ ہمچو خط پرکار
ہر جا برسی بخود رسیدن باشد

(۳) کسی شے کی معرفت کے ذرائع ہمارے پاس یا تو حواس ظاہری یا قویٰ باطنی ہیں۔ حواس ظاہری باصرہ، سامعہ، شامہ، لامسہ، ذائقہ سے ہم صرف کائنات کی صورتیں ہی محسوس کرتے ہیں۔ ایک ہی شے کی مختلف صورتیں ہیں۔ حس بصر میں رنگ اور روپ اور سمع میں آوازیں، لمس میں نرمی وسختی وسردی وگرمی وغیرہ اور شامہ میں بو اور ذائقہ میں ترشی وشیرینی وغیرہ۔ یہ سب صورتیں ایک ہی شے کی ہیں اور ہم صورتوں کے سوا کچھ اور محسوس نہیں کر سکتے۔ اس لیے بظاہر جہاں تک ہمارے حواس ظاہری کا تعلق ہے محسوسات خارجی محض صورتوں کا مجموعہ ہے۔ اگر کائنات صرف صورتیں ہوں اور بعینہٖ ان کا نقش ہمارے قلب میں ہے تو یہ صورت خیال جو ہمارے قلب میں ہے، بعینہٖ اشیاء خارجی کی صورت ہو گی۔ لیکن صورتوں کے علاوہ اشیاء کے خواص یا حقائق بھی ہیں جو ان صورتوں میں رونما ہوتے ہیں۔ ہمیں ان حقایق کا علم دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک مشاہدہ اور تجربہ سے اور دوسرے ''وجدان'' سے۔ اگرچہ علم منطق میں وجدانی دلیل کمزور سمجھی گئی ہے مگر علم تصوف میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے اور استدلال عقلیہ کو عصائے کوران سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ''وجدان'' یا نور باطن یا بصیرت کو چشم

Marfat.com

بینا کا مشاہدہ قرار دیا گیا ہے جو آفتاب کو آفتاب کی روشنی میں مشاہدہ کرتی ہے اور بالبداہت ثابت شدہ حقیقت ہے جس کے لیے استدلالِ عقلیہ کی ضرورت نہیں۔

(۴) استدلال عقلیہ چند اُمور پر مبنی ہے۔

(الف) ''عینیت'' دو یا دو سے زیادہ اشیاء اگر ہر ایک مکان و زمان میں ایک جیسی ہوں تو وہ ایک ہی شے ہے، خواہ یہ پانی کا سمندر ہو یا پانی کا قطرہ، اگر فرق ہے تو ان کی مقدار میں ہے۔ ان کی نوعیت وغیرہ ایک ہی ہے۔

(ب) ''مماثلت'' اگر دو یا دو سے زیادہ اشیاء بعض امور میں ایک جیسی ہوں اور بعض امور میں مختلف، تو جہاں تک وہ ایک دوسری کی مثل ہے، اہل علم و حکمت ان کو ایک ہی طبقہ میں شمار کرتے ہیں۔ مثلاً انسان ہر ایک مکان و زمان میں انسان ہے اور گاؤ وخر سے بعض اُمور میں مماثلت بھی ہے۔ طبقہ حیوانات میں جس حد تک مماثلت ہے انسان بھی حیوان ہے۔ ایک ہی طرح پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا، چلتا پھرتا اور آخر مر کر خاک ہو جاتا ہے۔

(ج) ''مشابہت''۔ مشابہت صوری اور معنوی بھی ہے۔ جب دو یا دو سے زیادہ اشیاء بعض امور میں ملتی جلتی ہیں، تو ان میں مشابہت پائی جاتی ہے۔

(د) ''تخالف''۔ دو اشیاء جو ایک دوسرے کے بعد مشاہدہ ہوں، یہ لفظ ''خلف'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ جو دوسری شے کے بعد آئے۔ باپ کا بیٹا خلف ہوتا ہے۔ اگرچہ ان دو اشیاء میں مماثلت و مشابہت بھی ہو۔ مگر مکان و زمان کے تغیر سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں اس لحاظ سے ایک دوسرے کی غیر ہے، خواہ یہ اعتباری ہو اور حقیقی نہ ہو۔

(ہ) ''تضاد''۔ دو اشیاء جب ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے نور و ظلمت، تو دونوں میں امتیاز محسوس ہو گا۔ لیکن ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ نور ظلمت اور ظلمت نور کے حالات سے بے خبر ہے۔

حکما طبعی کے نزدیک معرفت کا ذریعہ مماثلت اور مشابہت ہے۔ یعنی ہر ایک شے اپنے مثل سے یا ایسے امور سے جن میں مشابہت ہو پہچانی جاتی ہے۔ اگر ہم طبقہ جمادات اور نباتات اور حیوانات میں نظر کریں تو ہر ایک طبقہ اور اس کی انواع میں

Marfat.com

مماثلت اور مشابہت محسوس ہو گی اور ہر ایک طبقہ جتنا دوسرے طبقہ سے مختلف صورت اور خواص میں ہو گا اتنا ہی اس طبقہ سے الگ پہچانا جائے گا لیکن اہل تصوف کے نزدیک حقیقی معرفت کا ذریعہ ''عینیت'' ہے۔ یہ بات تو ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عمرو کو جو کچھ معرفت اپنی ذات کی ہے وہ زید کی شخصیت سے نہیں ہو سکتی، جب تک وہ زید کا ''عین'' نہ ہو۔ چونکہ دونوں میں انسانیت ایک امر مشترک ہے، اس لیے عمرو جو کچھ زید کی نسبت قیاس کرے گا وہ اسی انسانیت کی بنا پر کرے گا۔ یعنی اپنے ہی حالات پر قیاس کرے گا۔ اگر زید رونی صورت بنائے ہوئے ہو تو عمرو سمجھ لے گا کہ زید غمزدہ ہے خواہ وہ فی الحقیقت نہ ہو۔ اگر یہ ممکن ہو کہ عمرو زید کا عین بن جائے تو عمرو پر وہ سب کچھ منکشف ہو جائے گا جو زید کی حقیقت ہے۔

(و) کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے کسی شے کا علم کماحقہ حاصل ہے۔ اور حقیقت ہی یہی ہے کہ ایک ذرّہ کا علم بھی کماحقہ، کسی کو حاصل نہیں۔ اس حقیقت کو اہل تصوف نے خوب سمجھا تھا۔

علامہ محمود شبستریؒ ''گلشن راز'' میں کہتے ہیں کہ:

دل یک قطرہ را گر واشگافی بروں آید ازو یک بحر صافی

بیدلؔ کہتا ہے کہ:

ذرّہ از سامانِ مہر و قطرہ از دریا پُرست
ایں دل حیرت سرا از نقش قدرتہا پُرست

اس لیے ہر ایک شے محدود بھی ہے اور غیر محدود بھی۔ جہاں تک ہمارے دائرۂ علم میں آ چکی ہے اس حد تک تو محدود ہے، اور جو ابھی تک ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہے، وہ غیر محدود ہے اور صحیح بھی ہے کہ ہر ایک شے ہمیشہ غیر محدود رہے گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو ذہنی ارتقا رک جائے گا۔ اور یہ جو نئے نئے علمی اور فنی اکتشافات ہو رہے ہیں، ختم ہو جائیں گے۔

تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے کے دو رُخ ہیں، جس کو لسان قرآن میں عالم غیب و شہادت کہا گیا ہے یا جس کو ظاہر و باطن کہتے ہیں اور اصطلاح تصوف

Marfat.com

میں آفاق اور انفس سے موسوم کیا گیا ہے اور انسان میں بھی یہی دو باتیں ہیں۔ ایک جسم اور دوسرا قلب۔ صوفیائے محققین کہتے ہیں کہ مثل کو مثل پہچانتا ہے۔ اضداد ایک دوسرے کی معرفت سے بے خبر ہیں اس لیے حقائق کائنات کی معرفت جو ''الغیب'' ہیں ''قلب'' ہی کو ہوتی ہے۔

لیکن یہ واضح بات ہے کہ ہمیں کسی شے کی معرفت کماحقہ نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو اہل تصوف نے تو اچھی طرح سمجھ لیا لیکن حکما طبعین وغیرہ نے نہیں سمجھا۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی کسی نے مشاہدہ کیا وہ تا حد نظر صحیح کیا۔ اس لیے اس کا انکار نہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ شیخ اکبرؒ کہتے ہیں کہ ''لوگوں نے حقیقت بلکہ حقیقۃ الحقائق کو اپنے اپنے عقائد میں محدود رکھا ہے اور ان کو بصیرت نہیں کہ وہ کسی دوسرے کے عقائد میں بھی دیکھتے۔ عارف وہ ہے جو ہر ایک عقیدہ میں دیکھے مگر کسی عقیدہ میں محدود نہ کرے۔'' عارف رومیؒ کے ہمعصر سراج الدین قونوی بڑے رتبے کے فاضل تھے لیکن مولانا سے کسی وجہ سے کبیدہ خاطر رہتے۔ کسی نے ان سے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ میں تہتر فرقوں سے متفق ہوں۔ فاضل قونوی نے ایک شاگرد کو مولانا کے پاس بھیجا اور خوب سکھا پڑھا دیا کہ یہ اور وہ سوال کرنا اور پوچھنا کہ کیا تمہیں سب مذاہب سے اتفاق ہے اور اگر وہ اثبات میں جواب دیں تو خوب خبر لینا۔ چنانچہ مولانا نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے خوب مغلظات منہ پر سنائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے اس سے بھی اتفاق ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا — دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ باد دہستانت خلاف است و جنگ

علوم وفنون بے شمار ہیں اور کسی ایک شخص کا احاطہ ان سب پر نہیں ہو سکتا۔ البتہ کوئی علم ہندسہ میں طاق ہے تو کوئی علم منطق میں شہرۂ آفاق ہے۔ کوئی علم کیمیا میں ماہر سمجھا جاتا ہے، کوئی علم و ادب میں دادِ سخن دے رہا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے اور نفسیات کا اہم مسئلہ ہے کہ جو جس علم میں یکتا ہے حالانکہ اس کو جیسا کہ ہم اوپر تشریح کر چکے ہیں، اس علم کی جزئیات ہی کا علم ہے۔ وہ ہر ایک مسئلہ کو اسی اپنے علم کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تمام کائنات کی گتھی اسی ایک علم کے جزوی علم

Marfat.com

سے سلجھانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ مادہ پرست کہتے ہیں کہ تمام کائنات مادہ ہے اور جسے غیر مادی اشیاء کہتے ہیں وہ مادہ ہی کے خواص ہیں اور اس سے کچھ علیحدہ شے نہیں۔

منطقی یہ کہتا ہے کہ استدلال عقلیہ سے جو بات ثابت نہ ہو، قابل قبول نہیں۔ خیالات اور اوہام میں امتیاز اسی علم ۔سے ہوتا ہے اور صحیح فکر اور صحیح کلام کا واحد ذریعہ یہی علم ہے۔

ریاضی دان کہتا ہے کہ تمام کائنات میں اصول وقواعد ریاضی کارفرما ہیں اور اشیاء کا باہمی تناسب وطول وعرض اسی علم سے دریافت ہوتا ہے۔

عالم کیمیا کہتا ہے کہ ہر ایک شے کے اجزا خاص مقدار اور نسبت سے ملے ہوئے ہیں اور اگر یہ نسبت معلوم ہو تو یہ شے ہم بھی بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ بنا کر دکھا بھی دیتا ہے۔

اور علیٰ ہذا القیاس، اگر ان سب کے دعاوی پر غور کیا جائے تو ان میں سے ایک بھی غلط نہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی تحقیق تاحد نظر ہے اور جو کچھ وہ مشاہدہ کرتا ہے، صحیح ہے۔ غلطی یہ ہے کہ اس کو اگر کسی علم میں دسترس ہے تو جزوی ہے، جس کو وہ ''کلی'' سمجھ رہا ہے، اور دیگر علوم وفنون کے کلیات پر بھی احاطہ کرنا چاہتا ہے۔ اہل تصوف اس حقیقت سے تو خوب واقف ہیں کہ مادہ پرست صرف ظاہر بین ہیں اور ظاہر پر بھی بخوبی مطلع نہیں اور جو صرف عالم کو محض خیال تصور کرتے ہیں اور مادہ پرستوں کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے، اس لیے ایک دوسرے کا انکار کرتے ہیں۔ وہ بھی جزو کو کل سمجھے بیٹھے ہیں۔ لیکن ان کے مشاہدہ میں بھی صداقت ضرور ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ زندگی چند روزہ ہے۔

''تھوڑی سی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے''

کوئی ایسا علم یا فن اختیار کرنا چاہیے کہ ''کل'' کا علم نہ ہو سکے تو اس سے وابستگی تو ہو۔

مولانا جامیؒ کہتے ہیں کہ:

اندیشۂ گل اگر کنی گل باشی
در بلبل بے قرار بلبل باشی

Marfat.com

تو جزوی و حق کُل است روزے چند
اندیشۂ کُل اگر کنی کُل باشی
(جامیؒ)

اس رباعی کا مفہوم ''اخلاقیات'' کے تحت واضح کیا گیا ہے۔

ارشادِ قرآن ہے کہ:

''کذٰلک زینا لکل امّة عملهم، ثم الی ربهم مرجعهم فینبئهم بما کانوا یعلمون'' (۷/۱۹)

''اسی طرح ہم نے ہر ایک فرقہ کے لیے ان کے عمل کو بھلا دکھایا۔ پھر جب وہ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کریں گے تو ان کو جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں (ان کی حقیقت سے) خبردار کر دے گا۔''

اہل تصوف نے یہ حقیقت ذہن نشین کر لی کہ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے تو تمام اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ یہ اختلافات جزو پرستوں میں ہیں کہ کل میں سب اختلافات محو ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان کا رجوع بہرحال اللہ ہی کی طرف ہے۔

(ز) تذکر و عبرت و تدبر و تفکر علمی اصطلاحات ہیں اور قرآن میں اکثر استعمال ہوئی ہیں اور تصوف میں بھی جہاں تک استدلال عقلیہ کی ضرورت ہے، انہی پر زور دیا گیا ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان اصطلاحات کی تشریح کی جائے۔

علامہ محمود شبستریؒ ''گلشن راز'' میں لکھتے ہیں کہ:

تفکر رفتن از باطل سوئے حق بجز داندر بدیدن وجہ مطلق

تفکر باطل سے جو ہمیشہ معرض فنا اور تغیر و تبدل قبول کرتا ہے، حقیقت کی طرف رجوع کرنا ہے اور جزو میں کل کا مشاہدہ کرنا ہے۔

حکیماں کاندریں کردند تصنیف چنین گفتند در ہنگام تعریف

تفکر وغیرہ کی تعریف اہل حکمت نے اپنی تصانیف میں اس طرح کی ہے:

ہر چوں در دل بود حاصل تصور نخستین نام اُو باشد تذکر

Marfat.com

کہ جب ذہن میں کسی شے کا تصور حاصل ہو تو اس تصور کا ابتدائی نام تذکر ہے، جس کا تعلق قوت حافظہ سے ہے، جس میں اس شے سے ملتی جلتی کچھ اور بھی صورتیں محفوظ ہیں، جن سے اس شے کی مماثلت وغیرہ دریافت کی جاتی ہے۔

دزد چوں بگذری ہنگام فکرت بود نام وے اندر عرف عبرت

جب اس تذکر سے فکر کرتے ہوئے تو عبور کرتا ہے تو اصطلاح میں اس کو ''عبرت'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تصور کاں بود بہر تدبر بنزد اہل عقل آمد تفکر

جب کسی شے کے تصور سے کوئی منصوبہ یا تدبیر اخذ کرنی مقصود ہو تو اہل عقل کے نزدیک اس کو تفکر سے تعبیر کرتے ہیں۔

ز ترتیب تصورہائی معلوم شود تصدیق نامعلوم مفہوم

ایسے تصورات جو ہمارے حافظہ میں محفوظ ہوں اور ان اشیاء کے حقائق کا بھی عمل علم ہے جن کے یہ تصورات ہیں اور تذکر سے ہم انہیں اپنے دیدہ دل کے ساتھ لاتے ہیں تو ان کو ایک خاص ترتیب میں رکھنے سے ایسا نتیجہ جو نامعلوم ہو معلوم ہو جاتا ہے۔

دلے ترتیب مذکور از چہ وچوں بود محتاج استعمال قانوں

لیکن یہ خاص ترتیب جو تصور ہائے معلوم میں دی جائے گی ایک خاص قانون کے تحت ہی ہو گی، جسے علم منطق نے واضح کیا ہے۔

دگر بارہ دراں چوں نیست تائید ہر آئینہ کہ باشد محض تقلید

یہ ترتیب صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے اہل تحقیق ہی کا کام ہے اور جنہیں اس علم سے بہرہ نہیں، ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اہل تحقیق کی تقلید کریں۔

(ح) عقلی استدلال دو یا دو سے زیادہ اشیاء کا تقابل ہے اور اس تقابل سے اس ''نسبت'' کا دریافت کرنا ہے جو مستقل ہو یا غیر مستقل، جن سے اشیاء ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ جب دونوں اشیاء حواس ظاہری کے سامنے موجود

Marfat.com

ہوں یا ان میں ایک ہو یا دونوں کے تصورات دیدہ دل کے سامنے موجود ہوں اور ان کا باہمی رشتہ بھی محسوس ہوتا ہو تو اصطلاح میں اس کو ''مشاہدہ'' سے موسوم کرتے ہیں۔ اگر بالبداہت ثابت شدہ امر ہو تو مزید استدلال کی ضرورت نہیں۔

''آفتاب آمد دلیل آفتاب''

''مشاہدہ'' کی تین قسمیں ہیں۔ مشاہدہ حسی اور مشاہدہ عقلی اور مشاہدہ وجدانی، مولانا رومیؒ نے ان مشاہدات پر مفصل بحث کی ہے۔ اقتباس حسب ذیل ہے:

یک مثال اے دل پے فرقے بیار | تابدانی ''جبر'' را از ''اختیار''
دست کاں لرزاں بود از ارتعاش | وانکہ دستے را تو لرزانی زجاش
ہر دو جنبش آفریدہ حق شناس | لیک نتواں کرد ایں یا آں قیاس
زیں پشیمانی کہ لرزانیدنش | چوں پشیماں نیست مرد مرتعش
بحث عقل است ایں چہ بحث ست حیلہ گر | تا ضعیفی رہ برد آنجا مگر
بحث عقلی گر درد مرجاں بود | آں دگر باشد کہ بحث جاں بود
بحث جاں اندر مقامے دیگر است | بادہ جاں را قوامے دیگر است
آں زماں کہ بحث عقلی ساز بود | ایں عمر با بوالحکم ہم راز بود
چوں عمر از عقل آمد سوئے جاں | بوالحکم بوجہل شد در بحث آں
سوئے حس وسوئے عقل او کامل است | گرچہ خودنسبت بجاں او جاہل است
بحث عقل وحس اثرواں یا سبب | بحث جانی یا عجب یا بوالعجب
ضوء جاں آمد نماند اے مستضی | لازم و ملزوم و فانی مقتضی
زانکہ بینا راکہ نورش بازغ است | ازعصا و از عصا کش فارغ است

ایں عصا چہ بود قیاسات و دلیل

مشاہدہ ''حسی'' تو اہل عقل و حکمت کے نزدیک لایق اعتبار نہیں۔ یہی سطحی مشاہدہ ہے جس کا کرشمہ ''ایام جاہلیت'' میں جن کو تاریخ میں ازمنہ تاریخ (dark ages) کہتے ہیں، یہ تھا کہ مظاہر فطرت کو دیوتا اور دیویاں تصور کیا۔ ان کی مورتیاں

Marfat.com

اپنے ہاتھوں سے گھڑیں اور ان کی پوجا کی۔ قرآن حکیم میں اس کو ''افک'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''افک'' ایسا جھوٹ ہے جو بادی النظر میں سچ محسوس ہو۔ اور ایسا جھوٹ لوگ اپنے تصورات ماضی کو سامنے لاتے ہوئے قیاس کرتے ہیں۔ اس میں قوت واہمہ کا بھی دخل ہوتا ہے اور واہمہ ایسے نظارے دکھاتا ہے جو نفس الامر میں مستحق نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ایک شخص اندھیرے میں لاٹھی کو سانپ یقین کرتا ہے اور خوف زدہ ہو کر بھاگتا ہے۔ لاٹھی اور سانپ دونوں تصورات معلومہ ہیں۔ ایک تو حواس ظاہری کے سامنے موجود ہے اور دوسرے کا تصور دیدہ دل میں ہے۔ ایسے تصورات بھی ہوتے ہیں جو عنقا ہوں مگر لوگ اس میں تصورات معلومہ کی بات پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ مثلاً کسی دیوتا کا سر شیر کا، پیٹ اونٹ کا، پاؤں بیل کے، بھان متی کا کنبہ جوڑا، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔

تصوف میں بحث عقل اور وجدانی مشاہدہ پر ہے۔ اس موضوع پر مولانا رومیؒ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس پر کل صوفیہ محققین کا اتفاق ہے۔ حافظ کہتا ہے کہ:

خرد ہر چند نقد کائنات است
چہ سنجد پیش عشق کیمیا کار

''عقل'' جبرائیل کی طرح ایک حد تک پرواز تو کر سکتی ہے لیکن اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی سوزد پرم

یہ عصائے موسیٰ ہے کہ اگر ید بیضا کے قبضہ میں نہ ہو تو خطرناک سانپ ہے۔ اور یہ امر بالبداہت ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اس عقل نے بحر و بر میں کیا کچھ طوفان فتنہ و شر برپا رکھا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عقل کی غلطیاں عقل ہی سے رفع بھی ہوتی رہتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل ہمارے اعمال کی محرک نہیں۔ محرک جذبات ہیں۔ عقل بمنزلہ خادم ہے۔ نفس انسانی اس سے جو بھی چاہے اچھا برا کام لے سکتا ہے اور لے رہا ہے۔ عقل عصائے کور ضرور ہے، اس لیے رہنما بھی ہے اور اگر اس کے ساتھ چشم بینش بھی ہو تو سبحان اللہ۔ صوفیہ کرام عقل کی مذمت نہیں کرتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ علم معرفت حق تعالیٰ محض عقل سے ممکن نہیں۔ علامہ نجم الدین محمود شبستریؒ کہتے ہیں کہ:

ہر آں کورا کہ ایزد راہ ننمود
ز استعمال منطق، ہیچ بکشود

Marfat.com

''سوفسطہ'' (sophists) کا دارو مدار علم منطق پر ہے۔ لیکن اس علم سے ان پر کیا منکشف ہوا؟ ''نجم الدین النسفی'' عقائد کے شروع میں کہتے ہیں کہ:

قال اهل الحق حقائق الاشيا ثابة

والعلم بها مستحق خلافا للسوفسطائيه

علامہ سعدالدین تفتازانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''سوفسطائیہ تین قسم کے ہیں۔ عنادیہ، عندیہ اور لاادریہ۔'' عنادیہ تو حقائق اشیاء کے منکر ہیں۔ عندیہ کہتے ہیں کہ یہ عالم اوہام و خیالات ہے۔ حقائق ہمارے یقین کے تابع ہیں اگر ہم کسی شے کو کہیں کہ ''جوہر'' ہے تو وہ جوہر ہے اور اگر یہ یقین کرلیں کہ ''عرض'' ہے تو عرض ہے اور یقین کریں کہ ''قدیم'' ہے تو قدیم ہے اور کہیں ''حادث'' ہے تو حادث ہے اور ہر ایک تیقن کے لیے دلائل موجود ہیں۔ لاادریہ (agnostics) کہتے ہیں کہ ہمارے پاس نہ انکار کا اور نہ اقرار کا ثبوت موجود ہے۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ حقیقت کیا ہے اور آیا موجود ہے یا نہیں۔

سوفسطائیہ کے تینوں نظریے باطل ہیں۔ کوئی عقل مند یہ نہیں کہے گا کہ حقیقت اور خواص آب و آتش مجرد وہم و خیال ہے اور اگر ہے تو صرف تابع اعتقاد ہے اور ''لاادریہ'' جو ہر ایک شے کو شک کی نظر سے دیکھتے، وہ اپنے شک پر بھی شک کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا دعویٰ حق ہو کہ حقائق اشیاء باطل ہیں تو اس کا دعویٰ بھی باطل ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ بھی تو اسی کائنات باطلہ کا جزو ہیں۔

''از باطل سخن حق کہ باور دارد''

لیکن ان پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ ''یقینے خفتہ در ہر پردۂ ظن'' جب وہ کہتے ہیں کہ کائنات ایسی اور ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے تو تیقن کے ساتھ ہی کہتے ہیں اس لیے ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ شک کرنے والا خود مشکوک نہیں ہوسکتا۔

یہ بحث تو طویل ہے۔ ہمارا مقصد ان اشارات سے یہ ہے کہ یہ حقیقت ذہن نشین ہو جائے کہ لفظ ''صوفی'' لفظ ''سوفسٹ'' (سوفسطہ) سے ماخوذ نہیں۔ لیکن اس میں کچھ نہیں کہ علم کلام جیسا کہ سوفسط استعمال کرتے رہے حکما اسلام کو بھی استعمال کرنا پڑا۔ ان ایام میں اس کی غرض محض مدافعت تھی، تعمیری مقاصد بعد میں پیدا ہوئے۔ اس لیے جو

Marfat.com

کچھ ان حضرات نے اس موضوع پر لکھا وہ ضرورتاً لکھا اور اگر مدافعت کی ضرورت کا احساس نہ ہوتا تو غالباً علم کلام کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کرتا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اکثر ائمہ دین علم کلام کو مکروہ ہی سمجھتے رہے، اس لیے کہ اس نے دین میں نئی نئی بحثوں کی طرح ڈال دی۔ سب سے زیادہ جو لوگ علم کلام یا یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے وہ معتزلہ تھے اور اَلنسفی اور دیگر اکابر نے ان کے عقائد کے خلاف زور طبع و قلم خوب دکھایا۔ لیکن رفتہ رفتہ مخالفت کا زور کم ہوتا گیا اور غالباً اس لیے کہ ''الاشعری'' نے معتزلہ کا زور توڑ دیا۔ اور دنیا اسلام میں بالخصوص اہل سنت والجماعت کے عقائد آج تک وہی کچھ ہیں جس کی تشریح علامہ تفتازانی نے شرح عقائد میں کی ہے اور اس وقت سے علم کلام کی طرف توجہ زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔ چنانچہ حکما اسلام کی تصنیفات میں یہی علم کلام پایا جاتا ہے۔ اور اس کو شریف ترین علم خیال کیا گیا۔ علوم کلام کا مدار استدلالِ عقلیہ پر ہے۔ ہستی محدثات سے ہستی صانع محدثات یا کائنات پر اثبات کرنا اہل تصوف کے نزدیک اسی حد تک ہے کہ جس کو شیخ سعدی ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

پیش بیناں بارگاہ الست   پیش ازیں رہ نبردہ اند کہ ہست

اور صاحب ''گلشن راز'' کہتا ہے کہ:

چو آیات اور وشن گشتہ از ذات   نگردد ذات او روشن ز آیات

اس کی مثال نور شمع کی ہے کہ ایک تاریک کمرہ اور اس کمرہ کی تمام اشیاء کو روشن کر رہا ہے۔ یہ کمرہ اور اس کی اشیاء شمع کو روشن نہیں کرتیں۔ بلاشبہ عقل بھی نور ہے اور اس سے اشیاء کے بہت تاریک پہلو روشن ہوتے ہیں لیکن یہ بھی محدثات میں سے ہے۔

زہے ناداں کہ او خورشید تاباں   بنور شمع جوید در بیاباں

بیاباں میں شمع کے نور سے خورشید تاباں کی تلاش کرنا محدثات کی ہستی سے ان کے صانع پر استدلال کرنا ہے، جو صحیح نہیں۔

اس لیے صوفیہ محققین نے ان اسماء و صفات الٰہیہ کی جو قرآن میں بھی مذکور ہیں، یہ توجیہہ کی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کو ان سے موسوم اور موصوف بنانا اس کو مشخص اور

Marfat.com

معین کرنا ہے جو صحیح نہیں۔ علاوہ ازیں ان اسماء و صفات کا اطلاق مخلوقات پر بھی ہوتا ہے۔ ان میں سے سمیع و بصیر و حکیم و مرید بھی ہیں۔ اس لیے اگر ذات حق تعالیٰ کی نسبت بھی یہی کچھ کہا جائے جو انسان کی نسبت کہا جاتا ہے تو شرک فی الاسما والصفات ہوگا۔ اس لیے یہ بھی صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقت مجردہ ہے اور حقیقت مجردہ کا احساس انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ احساس اسی وقت ہوگا جب وہ کسی صورت میں رُونما ہوگا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ:

"ما کان بشر ان یکلمه الله الا وحیا اومن دراء حجاب او یرسل رسولاً فیوحیٰ باذنه مایستاء انه' علیم حکیم" (۲۵/۶)

"یہ تو کسی بشر میں تاب و طاقت نہیں کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر (اس کی تین ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ) وحیاً یا پردہ کی اوٹ (اشیاء کی صورت میں جیسے بیداری یا خوابوں یا رویا میں) یا کسی رسول (بشر) کے ذریعہ تو وہ اس کے اذن سے جو منشا خداوندی ہوتا ہے، وحی کرتا ہے۔ تحقیق وہ علم والا، حکیم ہے۔"

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا کلام حقیقت مجردہ ہے اور انسان میں یہ تاب نہیں کہ اسے محسوس کر سکے۔ اس کا احساس یا تو وحیاً ہوگا جو بلفظہٖ ہوگی یا رویا میں اشیاء محسوسہ کی صورت میں جو تعبیر کی طرح ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے علو مرتبہ اور حکمت سے بعید ہے کہ وہ ہر ایک شخص سے جس کا تزکیہ نفس و تصفیہ قلب نہ ہوا ہو وحیاً یا من ورا حجاب کلام فرمائے۔ اس کے لیے ایسے افراد کا انتخاب فرماتا ہے جن کو اصطلاح میں رسول کہتے ہیں اور ان کے ذریعہ عام لوگوں سے وہی کلام فرماتا ہے جو رسولوں کو وحی ہوتا ہے اور رسول بلفظہٖ بے کم و کاست لوگوں کو بھی وہی کلام سنا دیتے ہیں اور اس طرح سامعین کے دل میں وحی کرتے ہیں۔

کسی انسان کے دل میں کوئی خیال بلا الفاظ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جو کچھ بھی وحی ہوگا بلفظہٖ ہوگا۔

بیدلؔ کہتا ہے کہ فہم معانی بے کسوت عبارات محال ہے۔ زبان تو ایک آلۂ صوت بے شعور ہے، جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ غرض تمام احساسات بلاصورت کبھی نہیں ہوتے۔ اس لیے حق تعالیٰ کی نسبت اگر ہم کہیں کہ ایسا اور ایسا ہے اور

Marfat.com

ایسا اور ایسا نہیں ہے تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ فی الحقیقت ایسا ہے اور ایسا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم ان اشارات کے بغیر اپنا فی الضمیر واضح نہیں کر سکتے اور نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "لیس کمثلہ شی وھو السمیع البصیر" (۲۵/۳) جب یہ کہا جائے گا کہ حق تعالیٰ کی مثل کوئی شے نہیں تو ذہن انسانی میں اس کی ہستی کی نسبت کچھ بھی کیفیت پیدا نہ ہوگی اور جب یہ کہا جائے گا کہ وہ سمیع و بصیر ہے تو ایک کیفیت ضرور ذہن میں حاصل ہوگی اور جب نفی و اثبات دونوں پر غور کرے گا تو ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ سمیع و بصیر تو ہے مگر اس کی سماعت اور بصارت کسی ایسی شے کی سمع و بصر پر قیاس نہیں ہو سکتی جو مخلوق ہے۔ اس سے بھی ایک کیفیت ذہن میں آتی ہے۔

چونکہ تصوف کا موضوع ہی حق تعالیٰ کی معرفت ہے اس لیے صوفیہ محققین نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ علم معرفت علم کلام ہے۔ معرفت کچھ اور شے ہے جہاں مجال گفتگو نہیں۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبر اند — کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اہل تصوف یہ کہتے ہیں اور ان کا ارشاد سمجھنے کی چیز ہے کہ ہمیں معرفت حق تعالیٰ اس طرح نہیں جیسے فلسفی حکماء کو۔

ہر آں کس را کہ ایزد راہ ننمود — ز استعمال منطق ہیچ نکشود
حکیم فلسفی چوں ہست حیراں — نمی بیند در اشیاء غیر امکاں
ز امکاں می کند اثبات واجب — ازاں حیراں شدہ در ذات واجب
گہے از دور دارد سیر معکوس — گہے اندر تسلسل گشتہ محبوس
چو عقلش کرد در ہستی توغل — فرد پیچید پایش در تسلسل
ظہور جملہ اشیاء بضداست — ولے حق را نہ مانند و نداست
چو نبود ذات حق را ضد و ہمتا — ندانم تا چگونہ داند اُو را
ندارد ممکن از واجب نمونہ — چگونہ دانَدش آخر چگونہ
زہے ناداں کہ اُو خورشید تاباں — بنور شمع جوید در بیاباں

Marfat.com

اگر خورشید بر یک حال بودے — شعاع او بیک متوال بودے
ندانستے کسے کیں سایہ اُوست — نبودے ہیچ فرق از مغز تا پوست
چو نور حق ندارد نقل و تحویل — نیابد اندر و تغیر و تبدیل
تو پنداری جہاں خود ہست دائم — بذات خویشتن پیوستہ قائم
کسے کو عقل دور اندیش دارد — بسے سر گشتگی در پیش دارد
خرد را نیست تاب نور آں رو — برد از بہر خود چشمے دگر جو!
دو چشم فلسفی چوں بود احول — ز وحدت دیدن حق شد معطل
ز نابینائی آمد رائے تشبیہ — ز یک چشمست ادراکاتِ تنزیہ
تناسخ زآں سبب شد کفر باطل — کہ آں از تنگ چشمی گشت حاصل
چو اکمہ بے نصیب از ہر کمال است — کسے کورا طریق اعتزال است
از دہر چہ بگفتند از کم و بیش — نشانے دادہ انداز دیدہ خویش!
منزہ ذاتش از چند و چہ و چوں — **تعالیٰ شانہ عما یقولون**
در آلا فکر کردن شرط راہ است — ولے در ذات حق محض گناہ است
بود در ذات حق اندیشہ باطل — محال محض واں تحصیل حاصل
چو آیات است روشن گشتہ از ذات — نگردد ذات اُو روشن ز آیات
ہمہ عالم بنورِ اُوست پیدا — کجا او گردد از عالم ہویدا
رہا کن عقل را با حق ہمی باش — کہ تاب خود ندارد چشم خفاش
چہ نسبت خاک را با عالم پاک — کہ ادراک است عجز از درک ادراک
دریں مشہد کہ انوار تجلی است — سخن دارم ولے ناگفتن اولی است
اگرچہ خور بچرخ چارمیں است — شعاع نور ذاتش برزمیں است
چو چشم سر ندارد طاقت و تاب — تواں خورشید تاباں دید در آب
ازو چوں روشنی کمتر نماید — در ادراک تو حالے سیفراید!

علامہ نجم الدین محمود نے ''گلشن راز'' کے ان اشعار میں علم معرفت چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے مطالب سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کی دو آیات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

''اللہ نور السموٰات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃٍ فیھا مصباح ط

المصباح فی زجاجتہٖ ط الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃٍ مبٰرکۃٍ زیتونۃٍ لا شرقیّۃٍ ولا غربیّۃٍ یّکاد زیتھا یضیٓئُ ولولم تمسّہ نار ط نور علٰی نور ط یھدی اللّٰہ لنورہٖ من یّشآءُ ط ویضرب اللہ الامثال للناس ط واللہ بکلّ شی علیم ○ فی بیوتٍ اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیھا اسمہ یسبّح لہ فیھا بالغدوِ والآمال○" (۱۸/۱۱)

"اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ جیسی ایک طاق ہو اور اس میں چراغ ہو اور چراغ قندیل شیشہ میں اور شیشہ گویا درخشندہ ستارہ ہے۔ اس میں روشنی زیتون کے مبارک درخت سے آتی ہے جو نہ تو شرق کی طرف ہے اور نہ جانب غرب اور اس میں قابلیت روشنی کی اتنی ہے کہ اس کا تیل بغیر آگ چھونے کے جل اٹھے۔ (یہ تمام حجاب طاق و چراغ و فانوس) نور علٰی نور ہو جاتے ہیں۔ (اگرچہ بذاتہٖ تاریک ہیں) اللہ جسے چاہے اپنے نور سے ہدایت فرماتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لیے امثال بیان فرماتا ہے (کہ سمجھیں) اور اللہ ہر ایک شے کا پورا علم دائمی رکھتا ہے۔ (اس نور کی تلاش کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں) گھروں میں ہی ملتا ہے۔ اللہ کا اذن ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر بلند کیا جائے۔ اس کے نام پر، اس کی تسبیح صبح و شام اس میں کرتے ہیں۔"

سمٰوٰت والارض اور جو کچھ ان میں ہے بذاتہٖ تاریک ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تاریک اشیا نہ تو اپنے آپ کو اور نہ کسی دوسری شے کو روشن کر سکتی ہیں۔ اللہ کا نور انہیں روشن کر رہا ہے۔ نور کی تعریف ہے جو بذاتہٖ روشن ہو اور دوسری اشیا کو روشن کرے۔ اس لیے اہل نظر کی نگاہ سب سے پہلے اسی نور پر پڑتی ہے بلکہ نظر بھی اسی نور سے بصیرت حاصل کرتی ہے، لیکن ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ ہم ان اشیا کو دیکھتے ہیں جن کو اس نور نے روشن کر دیا ہے اور قیاس یہ کرتے ہیں کہ یہ اشیا بذاتہٖ روشن ہیں لیکن جن کو بصر و بصیرت حاصل ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کو روشن کرنے والا ایک نور ہے اور "ہمیں نور است رہبر تا بخورشید" وہ آفتاب کی روشنی میں آفتاب کو دیکھتے ہیں نہ کہ اشیا کی تاریکی سے۔ وہ اسی نور سے چشمہ نور کو دیکھتے ہیں۔ اسی طرح اہل صفا کا قلب اور نفس اور جسم اسی نور سے منور ہو جاتا ہے اور وہ اسی نور سے کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ نور نہ ہو تو تمام کائنات تاریکی میں ہوگی۔

Marfat.com

''الم ترالی ربک کیف مدّالظّل، ولرشا لجعله ساکناً ثم جعلنا الشمس علیه دلیلا، ثم تبضنٰہ الینا تبضاً یّسیرا''(۱۹/۳)

''کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ تیرے پروردگار نے کس طرح سایہ کو پھیلا رکھا ہے اور اگر چاہتا تو اسے ساکن کر دیتا۔ پھر آفتاب کو اس پر دلیل بنایا، پھر ہم نے اس کو اپنی طرف درجہ بدرجہ کھینچا۔''

یہ دو آیاتِ مبارکہ ہیں جن کی ترجمانی علامہ محمود نے اشعار مذکورہ میں کی ہے۔ قبل اشعار میں لکھتے ہیں کہ:

محقق را کہ از وحدت شہود است نخستیں چشم بر نور وجود است
ولے کز معرفت نور صفا دید زہر چیزے کہ دید اول خدا دید

حقیقت بھی یہی ہے کہ نگاہ سب سے پہلے نور پر پڑتی ہے اس کے بعد اشیا پر، یعنی یہ نور اشیا کا مشاہدہ کرا رہا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنے میں کچھ الجھن نہیں کہ وہ اصل محسوس حق ہوتا ہے۔ خواہ ہمیں اس کا احساس نہ ہو اور کائنات معقول ہے خواہ ہمیں محسوس ہو رہی ہے۔ ان اشعار کا مطلب یہی ہے کہ ''وہ عارف کامل ہے جو کثرت کو نظر انداز کرتا ہے اور توحید عیانی تک اس کی رسائی ہے، اور اس مشاہدہ میں وہ حق کو، ظاہر کو، خلق کو، باطن میں دیکھتا ہے۔ اس لیے صوفیہ محققین کہتے ہیں کہ ''**الحق محسوس والخلق معقول**۔''

علم حق در علم صوفی گم شود ایں سخن کے با در مردم بود

یہ آیات مبارکہ اور اس کی تفسیر جیسی کہ علامہ محمود نے کی ہے، اگر اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے تو مسئلہ ''وحدت وجود'' بھی حل ہو جاتا ہے، جس پر مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

دوسری آیت مبارکہ کی تفسیر علامہ محمود نے یہ کی ہے کہ:

ظہور جملہ اشیاء بضد است ولے حق را مانند و نداست

ہمیں کبھی کسی شے کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا اگر اس کی ضد نہ ہوتی۔ اس لیے ہر ایک شے کی ضد ہی اس کے ظہور کا موجب ہے۔ اگر حق تعالیٰ کی بھی کوئی ضد ہوتی تو وہ بھی ایسا ہی ظاہر میں محسوس ہوتا، جیسے دیگر اشیا کائنات۔ اگر آفتاب ہمیشہ نصف النہار

Marfat.com

پر ہوتا تو ہمیں اس کی ضیا کا احساس تک نہ ہوتا اور اگر تاریکی محض میں ہوتے تو ہمیں نہ تاریکی کا احساس ہوتا اور نہ اس کی ضد نور کا۔ لیکن آفتاب اور سایہ کی موجودگی نے احساس امتیاز پیدا کر دیا اور دونوں کا ظہور ہم پر بوجہ اضداد ہوا۔ لیکن اللہ تو نور السمٰوات والارض ہے اور اس میں نقل وتحویل نہیں جیسے کہ آفتاب میں ہے۔ وہ تو ایک ہی حال پر ہے اس لیے ہمیں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم کائنات اور کائنات کی اشیاء کو دیکھتے ہیں حالانکہ انہیں دکھانے والا نور حق ہے۔

''لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللّطیف الخبیرہ قد جآء کم بصآئر من رّبّکم فمن البصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا'' (۱۹/۷)

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہمیں محسوس ہو رہا ہے وہی موجود ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں جو محسوس نہیں۔ اس لیے حکما طبعین یہ کہتے ہیں کہ جہاں قائم و دائم ہے۔ صوفیہ محققین کے نزدیک یہ نظریہ باطل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ صوفیہ کرام کا یہ دعویٰ کہ حق ہی موجود اور مشہود ہے دلیل کا محتاج ہے اور وہ دلیل کیا ہے؟

عقائد دو طرح سے قائم ہوتے ہیں۔ ایک تحقیق سے اور دوسرے تقلید سے، مؤخرالذکر زیر بحث نہیں۔ تحقیق کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک استدلال عقلیہ سے اور دوسرے کشف وحال سے۔ استدلال عقلیہ معتبر نہیں ہے۔ اس لیے کہ بقول رابرٹ سپنسر ''کسی زمانہ میں بھی حکما کا اتفاق کسی ایک نظریہ پر نہیں ہوا۔ اور اگر بالفرض یہ ممکن بھی ہو تو ناممکن ہے کہ خلف سلف سے اختلاف نہ کرے۔ اس لیے کہ ذہنی ارتقا رک جائے گا۔'' البتہ ایسے امور جو علما ثابت شدہ حقائق ہیں (sciences) اس کا انکار کوئی نہیں کرتا مگر ان حقائق کی نسبت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں ارتقا نہیں ہے۔ اس لیے انسانی علوم و فنون میں بھی استقلال نہیں، یہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ صوفیہ محققین یہ کہتے ہیں کہ ہم پر حقیقت کا انکشاف بطریق حال و مکاشفہ ہوا ہے نہ استدلال سے۔ اگر کشف وحال کا انکار اصحاب استدلال کریں تو اہل علم وحکمت (sciences) کو اپنے حالات پر غور کرنا چاہیے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ قانون کشش ثقل صرف نیوٹن پر منکشف ہوا۔ دُوربین صرف گلیلیو نے ایجاد کی۔ سیارگان کی رفتار وغیرہ ''کپلر'' نے دریافت کی۔ دنیا میں اور بھی اہل علم وحکمت ہیں لیکن ہمیشہ کسی حقیقت کا انکشاف ایک ہی شخص پر ابتدا میں ہوتا ہے۔ اگر

Marfat.com

وہ یہ کہے کہ اس نے استدلال عقلیہ سے دریافت کیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ:

''از حواس خویشتن بیگانہ است''

استدلال تو سب ہی حکما کرتے ہیں۔ ان پر کیوں کسی امر کا انکشاف نہیں ہوا۔ اسی کو صوفیہ ''کشف'' سے موسوم کرتے ہیں۔

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک   نقشہا بینی از آب و خاک

لیکن ہمیں اس امر کی ضرورت نہیں کہ ہم استدلال ہی سے ان کو قائل و معقول کریں جو کشف و حال کے منکر ہیں۔ اور اگر اس طرح ممکن بھی ہو تو اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں۔ اگر وہ تسلیم بھی کریں تو کیا فائدہ جب تک عملاً انہیں علم نہ ہو۔ اس لیے نیک مشورہ یہی ہے کہ تم بھی وہی طریق اختیار کرو جو صوفیہ کرام نے کیا ہے۔ پھر دیکھو کہ ان کے دعویٰ میں کہاں تک صداقت ہے۔

ذوق ایں مے نشناسی بخدا..........

جو شے ذوق سے تعلق رکھتی ہے اس کا ذائقہ سے کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ ایک کور مادر زاد کو آفتاب کی نسبت کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا ہے اور ایسا نہیں۔ آفتاب کو تو آفتاب کے نور ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ صوفیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم حق کا مشاہدہ حق کے نور سے کرتے ہیں۔ ''عرفت ربي بنور ربي'' البتہ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ ہر ایک محقق کی تحقیق تا حد نظر ہی ہوتی ہے۔ ایک شخص کے سایہ کو خاک پر تاریک اور دوسرا پانی میں تمثال دیکھتا ہے۔ اس لیے ایک محقق کہتا ہے کہ ''ما رايت شيأً الا درايت الله بعده''۔ اس لیے حقیقت اشیا کی صورتوں میں محجوب ہے اس لیے نگاہ پہلے نقاب پر پڑتی ہے اس کے بعد اس حسن پر جو زیر نقاب ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ''ما رايت شيأً الا درايت الله قبله'' اس کی تشریح ہم اشعار مذکور میں کر چکے ہیں۔

''ہر کس ایں جا از مقام و حال خود گوید خبر''

''مرتبہ یقین'' اصطلاح قرآن ہے اور تصوف میں لی گئی ہے۔ جہاں استدلال عقلیہ سے ''یقین'' کی کیفیت ذہن میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ سمجھنا چاہیے کہ استدلال بے یقینی کے احساس سے شروع ہوتا ہے۔

چوں یقیں منحرف افتاد دلائل بالید راستی رفت کہ ممنوں عصایم کردند

تصوف میں جہاں دلائل سے کام لیا گیا ہے وہاں خطاب انہی لوگوں سے ہے جو اہل یقین نہیں۔ اور قرآن میں بھی خطاب ''برہان'' انہی سے ہے جن کو قرآن میں ''ریب'' ہے۔ لیکن جس کو مرتبہ یقین حاصل ہے اسے استدلال کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ یقین مزعومہ یا موہومہ نہیں۔ انسان بلکہ جہلا بھی کسی بات پر یقین کرتے ہیں اور ان کا یقین پختہ بھی ہوتا ہے مگر تحقیق سے ان کا عقیدہ غلط ہی ثابت ہوتا ہے۔ ''یقین'' مشاہدہ حق ہے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کو ملکوت السمٰوات والارض کے مشاہدہ سے حاصل ہوا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابتدا میں مسلمانوں کے پاس قرآن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن جب ''علم کلام'' کا اثر ہوا تو تصوف میں بھی اس کا دخل ہو گیا۔ اگر عارف رومی یا دیگر اہل تصوف نے اس سے کام لیا تو خطاب انہی لوگوں سے ہے جو اہل یقین نہیں۔ اگر اسے ''دماغی تعیش'' کہا جائے تو کچھ بے جا بھی نہیں۔ علم کلام میں حظ نفس ضرور ہے۔

''قال را بگذار درمرد حال شو''

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

برگ سبز درختاں در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس لیے کائنات جو آیات الٰہیہ میں کم از کم اتنا تو یقین دلاتی ہیں کہ یہ باطل نہیں اور ان پر ایک ذات خالق کائنات موجود ہے جو واجب الوجود ہے۔ لیکن تصوف معرفت سے آگے ''حقیقت'' کا مقام ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں تمام اشارات منقطع ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ذوقی بات ہے۔ یہ کامل محویت کا مقام ہے۔ خود سالک کا علم و شعور بھی اس میں محو ہو جاتا ہے۔ معرفت میں سالک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کے سوا جو بھی محسوس ہوتا ہے ہستی موہومہ ہے۔ حقیقت میں یہ ہستی موہومہ محو ہو جاتی ہے۔ اس کو اصطلاح تصور میں مرتبہ ''لاتعین'' کہتے ہیں۔ جسے اصطلاح میں ''اللہ'' کہتے ہیں، وہ مرتبہ ''تعین'' ہے۔ کیونکہ ذات حق تعالیٰ اسماء و صفات سے معین و مشخص کی گئی ہے اور جو شے بھی مشخص و معین ہو وہ محدود ہو جائے گی۔ اس کی نفی کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' میں کی گئی۔ اس کلمہ میں ''لا'' سے مراد یہی مرتبہ ''لاتعین'' ہے۔ اس کو اصطلاح تصوف میں

Marfat.com

مرتبہ ''احدیت'' بھی کہتے ہیں اور جس مرتبہ میں ذات اسماء وصفات سے متشخص ہوئی ہے اس کو ''وحدت'' سے موسوم کرتے ہیں اور مقام محمود اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں کہ یہ معرفت کا انتہائی مقام ہے جہاں تک رسائی ممکن ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقام کی خبر دی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ انصاری کہتے ہیں کہ ''جو شخص مجھے اللہ سے ایک دم غافل کر دے امید ہے کہ حق تعالیٰ اسے بخش دے گا۔'' اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ اس مرتبہ کا نام ہے جو صفات نفیہ یا معنویہ سے موصوف ہے اور یہ علم و حیات و ارادہ و قدرت و کلام و سمع و بصر ہیں۔ ان کو اصطلاح میں صفات ثبوتیہ اور ائمہ صفات بھی کہتے ہیں۔ تیسرا مرتبہ واحدیت کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تمام اسماء و صفات مفصل ظاہر ہوئے ہیں اور کلمہ لا الـہ الا الـلـہ میں ''اللہ'' سے موسوم ہے۔ ان کو ''مشروطیہ'' بھی کہتے ہیں۔ اس میں ہر ایک اسم ''رب'' ہے اور مربوب کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً خالق رب ہے اور مربوب مخلوق۔ رازق رب ہے مرزوق مربوب۔ شیخ الاسلام کا یہ مدعا ہے کہ مجھے ان مراتب سے جن میں ذات اللہ سے موسوم ہے غافل کر کے مرتبہ ''لاتعین'' میں کوئی پہنچاوے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص تو خود جنتی ہو گا۔ ان مراتب کو اصطلاح میں ''علمیہ'' کہتے ہیں۔ کلمہ ''محمد الرسول الله'' میں مراتب ''عینی'' کہلاتے ہیں، جو اوّل الذکر میں مراتب لاتعین وتعین اول و دوم کے مقابل واقع ہیں۔ یہ عالم ارواح یا امر اور عالم مثال یا ملکوت اور عالم اجسام یا ناسوت سے موسوم ہیں۔ صحیح حدیث ہے کہ جس نے کلمہ ''لا اله الا الله محمد الرسول الله'' پڑھا جنت میں داخل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کلمہ کا جو کچھ مفہوم ہے اگر وہ کسی کا حال ہو تو بقول شیخ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ یقیناً جنتی ہے۔ جسے ''معراج'' کہتے ہیں، وہ انہی مراتب کی طرف عروج کرتا ہے۔ اس کے بعد حقیقت کا انکشاف خود بخود ہو جاتا ہے اور انسان کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ انسانی مقام معرفت ہے جو اس دنیا میں ممکن ہے۔

پرتوِ خورشید جز در خاک نتواں یافتن
یک زمین و آسمان از اصل خود دوریم ما
(بیدلؒ)

Marfat.com

تخلیقات کی سیرت پر دیگر کتب

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم — کیرن آرم سٹرانگ/محمد عاصم بٹ

نقوش سیرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم — مولف: نصرت علی اثیر

سیرت نبوی قرآنی (خطبات ماجدی) — مولانا عبدالماجد دریا آبادی

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم — حکیم محمود احمد ظفر

سیرت پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم — مولانا عبدالصمد رحمانی

تخلیقات

علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: 7238014

Email: takhleeqat@yahoo.com

Web Site: http://www.takhleeqat.com

Marfat.com

تخلیقات کی سیرت پر دیگر کتب

حضرت محمد ﷺ — کیرن آرم سٹرانگ / محمد عاصم بٹ

نقوش سیرت سرور انبیاء ﷺ — مولف: نصرت علی اثیر

سیرت نبوی قرآنی (خطبات ماجدی) — مولانا عبدالماجد دریا آبادی

سیرت خاتم النبیین ﷺ — حکیم محمود احمد ظفر

سیرت پیغمبر عالم ﷺ — مولانا عبدالصمد رحمانی

تخلیقات

علی پلازہ، 3 مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: 7238014

Email: takhleeqat@yahoo.com

Web Site: http://www.takhleeqat.com

علمِ تصوف

تصنیف خواجہ محمد عباداللہ اختر

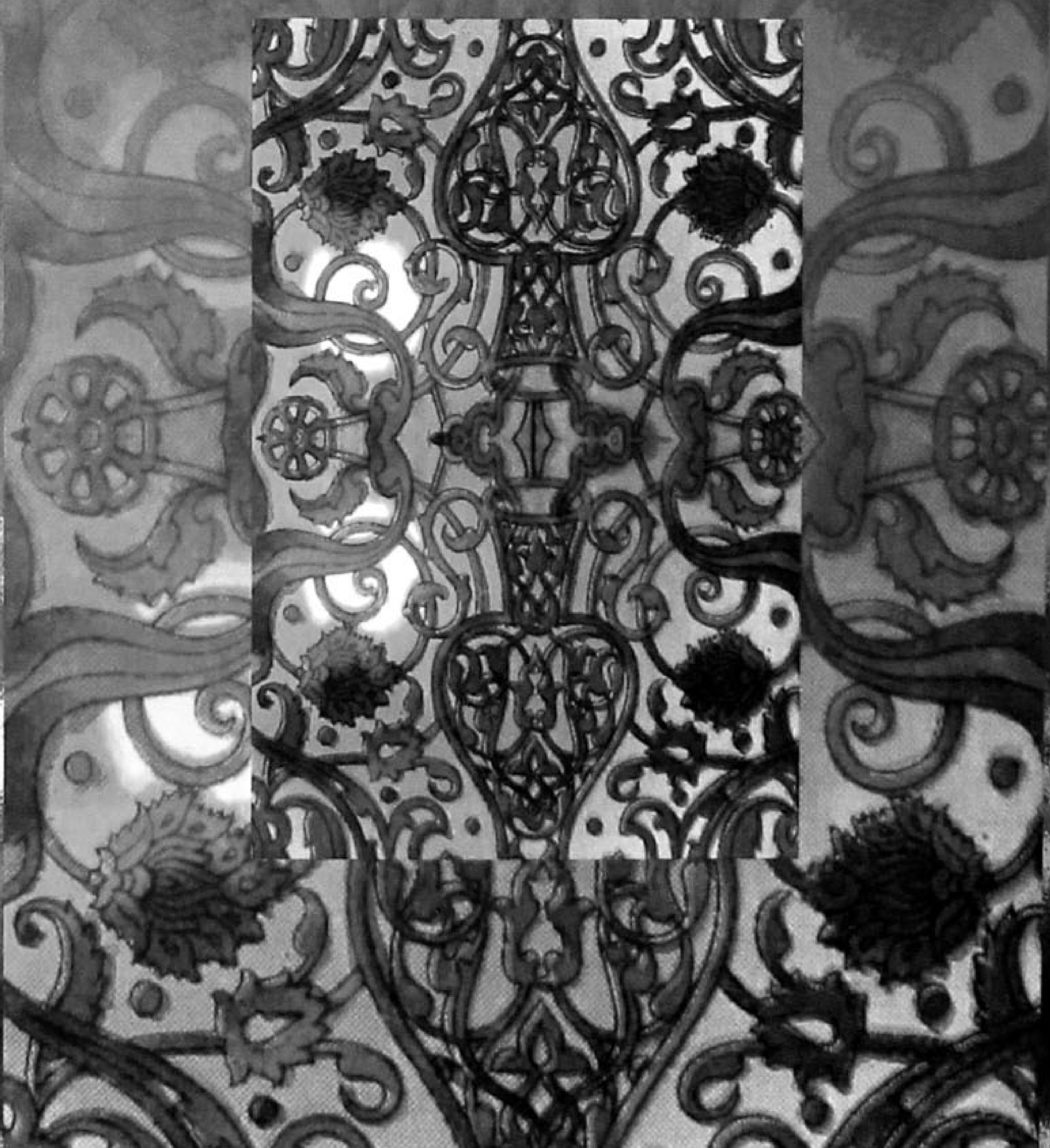

Marfat.com